بیادگار مسرت مراجعت فرمائی شہزادگان ذیشان

آصفیہ میگزین سہ ماہی
جلد اول شمارہ اول
جنوری سنہ ۱۹۴۰ء
زیر نگرانی
نواب میجر ممتاز یار الدولہ معتمد و بانی مدر
مدیر
سید حسن الدین
شریک مدیر
سید عابد علی
بی۔اے (عثمانیہ)
رفقاء
سید شریف الحسن بی۔اے (علیگ)
ڈپ۔اید (عثمانیہ)
قادر حسین خاں
منشی فاضل
مہتمم:- فیاض الدین
مقام اشاعت دفتر آصفیہ میگزین مدرسہ آصفیہ ملک پیٹھ
حیدرآباد دکن

کتاب نمبر

مقاصد

۱۔ [illegible] مضامین، معیاری نظمیں اور تحقیقاتی مقالات بالاقساط شایع کرنا۔

۲۔ [illegible] مطبوعات پر تنقید و تبصرہ کرکے عوام میں ذوق صحیح پیدا کرنا۔

۳۔ اردو ادب کی بے لوث خدمت اور غیر زبانوں کے شاہکاروں کو اردو زبان میں منتقل کرنا۔

قواعد

۱۔ آصفیہ میگزین عموماً جنوری، اپریل، جولائی، اکٹوبر۔ مطابق بہمن، اردی بہشت، امرداد، اور آبان میں شایع ہوگا۔

۲۔ اس رسالہ میں عموماً مشہور اہل قلم حضرات و خواتین کے مضامین افسانے، ڈرامے اور نظمیں وغیرہ بھی شایع ہوا کرینگی۔ طلباء کی دلچسپی کے لئے "بزم اطفال" بھی شامل رہے گا۔

۳۔ مضامین متعلقہ سیاسیات حاضرہ اور دل آزار مذہبی تنقیدوں کو کسی طرح جگہ نہیں دی جائیگی۔

۴۔ تمام مضامین نظم و نثر کے لئے مدیر اور دیگر امور کے لئے مہتمم رسالہ سے بالمشافہ گفتگو یا خط و کتابت کی جائے۔

۵۔ جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ کا آنا ضروری ہے۔

چندہ آصفیہ میگزین

خریداران حیدرآباد سے سالانہ عہ
فی پرچہ ۸ر
خریداران بیرون حیدرآباد سے سالانہ عہ مع محصول ڈاک
خریداران بیرون ممالک محروسہ سرکار عالی سے عہ کلدار
" " " غیر سے ۵ شلنگ
طلباء و طالبات سے عہ فی پرچہ ۶ر
بچوں کا حصہ سالانہ ۸ر
فی پرچہ ۲ر

نرخ اشتہارات

سائز		ایک سال کے لئے	فی اشاعت
پورا صفحہ	سرورق	عہ ۵	سے
	اندرونی	عہ	عہ
نصف صفحہ	سرورق	صہ	عہ ر
	اندرونی	سے	۲ر
		۱۲ر	
پاؤ صفحہ		عہ	۱۰ر
فی سطر		۸ر	۳ر

فہرست مضامین

بچوں کا حصہ

۱- تصویر مجلس مشاورت

۲- تصویر آصفیہ ہائی اسکول ملک پیٹھ

خدا کا شکر ہے کہ مدرسہ آصفیہ ملک پیٹھ سے ایک عام علمی و ادبی سہ ماہی رسالہ "آصفیہ میگزین" کا اجرا ایسے مبارک موقع پر عمل میں آرہا ہے جبکہ ہم سب وابستگان دولت آصفیہ کے دل شہزادگان والاشان اور دلہن شہزادیوں کی یورپ سے بخیر و عافیت مراجعت فرمائی کی خوشی سے معمور ہیں۔ اِس رسالہ کی اجرائی سے عرصہ قبل مدرسہ ہذا سے متعدد رسائل واخبارات موسوم بہ "افسر الاخبار" "آصفیہ گزٹ" اور "رسالہ دعوت" علی الترتیب شایع ہوتے رہے لیکن بعد میں چند ناگہانی حادثات و دیگر مشکلات کے باعث مدرسہ اُن کی اِشاعت سے قاصر رہا۔

اِس دفعہ عالیجناب نواب میجر ممتاز یار الدولہ بہادر بانی و معتمد مدرسہ کی علم پروری اور زبان اردو سے آپ کی غیر معمولی دلچسپی کی بدولت یہ رسالہ بڑی توقعات کے ساتھ جاری ہو رہا ہے۔

دورِ عثمانی کی دیگر ترقیوں کے منجملہ زبان اردو نے شاہانہ سرپرستی میں جو ترقی کی ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام سے اِس مملکت ابد مدت کی علمی سرگرمیاں آئے دن بڑھتی جارہی ہیں۔ اخبارات و رسائل کی تعداد میں روز افزوں اضافہ اس علمی بیداری کی رہین منت ہے۔ اردو زبان نہ صرف ہماری جامعہ ہی کی زبان بلکہ سرکاری زبان بھی ہے جس کے ذریعہ یہاں کے بسنے والے مختلف المذاہب افراد کے لئے مشترکہ پلیٹ فارم کی داغ بیل ڈالی جاسکتی اور مملکت دکن کی قدیم روایات اتحاد کو مستحکم بنیادوں پر کھڑا کیا جاسکتا ہے۔

آجکل جبکہ دنیا ایک انقلابی دور سے گذر رہی ہے زمانہ کے حالات ہم کو بھی اپنے ماحول کے اندر دعوت عمل دے رہے ہیں۔

قوموں کی تعمیر میں جو حصہ ادب کا ہے اس سے کوئی فرد انکار نہیں کرسکتا۔ یہ زندگی کے تقریباً ہر شعبہ پر حاوی ہے۔ اسلئے ادب ہی کے آئینہ میں ہم کسی قوم کے اعمال و کردار کی حقیقی اور جیتی جاگتی تصویر کو بے نقاب دیکھ سکتے ہیں رفتار زمانہ کے دوش بدوش ادب کو بھی اُن ہی میلانات اور رجحانات کو پیش نظر رکھ کر اپنے لئے ایسے سانچے

اور ڈھانچے تیار کرنے چاہیں جو زمانہ کے مذاق کی صحیح طور پر ترجمانی کرسکیں۔ ورنہ نہ وہ عصری ادب کہلانیکا ہرگز مستحق نہیں ہوگا۔ اور نہ وہ اُس زمانہ کی حقیقی تصویر کو صحیح طور پر پیش کرسکے گا۔ جو آنے والی نسلوں کے لئے چراغِ راہ کا کام دے سکے۔

مدارس میں رسالوں کے جاری کرنے کا اصل مقصد طلباء کی ذہنی تربیت اور اُن کے اندرونی میلانات اور رجحانات کا نشو و نما ہے تاکہ اُن کے فکر و خیال کی ترقی آئندہ میدان زندگی میں قوتِ عمل اور کامیاب حالات کے پیدا کرنے میں ان کے لئے ممد و معاون ہو۔ ہم اس اشاعت میں خاص طور پر مسٹر محمد علی جناح، مولانا ظفر علی خاں اور مس پدمجا نائیڈو صاحبہ کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ جنھوں نے باوجود گوناگون مصروفیات کے ہماری دعوت قبول کرکے طلباء کو بصیرت افروز پیامات دئیے۔

ہم اپنے قلمی معاونین میں سے خاص طور پر نواب فصاحت جنگ بہادر جلیلؔ۔ نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیزؔ حضرت امجدؔ۔ حضرت فانیؔ بدایونی۔ قاضی عبد الغفار۔ مولوی عبد الرحمن خاں۔ ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم۔ مولوی روشن علی شیدائی۔ حضرت علی اختر اخترؔ۔ جناب ماہر القادری۔ محترمہ بشیر النساء بیگم بشیرؔ۔ جناب مخدوم محی الدین، صاحبزادہ میکش صاحبان کا فرداً فرداً شکریہ ادا کرتے ہیں کہ جنکی قلمی اعانت اور مفید مشوروں نے اس رسالہ کو موجودہ معیار پر پہونچایا اور آئندہ بھی ہمیں توقع ہے کہ وہ اپنے مفید مشوروں سے مستفید ہونیکا موقع دیتے رہیں گے۔

کافی تعداد میں مضامین نسواں وصول ہونے پر "بزم اطفال" سے پہلے ایک اور حصہ "بزم خواتین" کا بھی اضافہ کیا جائیگا جس سے بڑی حد تک ہمارے رسالے کی اشاعت میں توسیع اور ہر طبقہ تک اُسکی رسائی ہوجائے گی۔

آخر میں ہم مجلس ادارت اور مجلس مشاورت کے سرگرم اراکین مولوی سید شریف الحسن صاحب بی۔ اے (علیگ) بی۔ ٹی (عثمانیہ) اور مولوی قادر حسین خاں صاحب منشی فاضل کا بھی شکریہ ادا کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ جنھوں نے اس کام میں ہر طرح کی سہولت بہم پہونچائی۔ ہم اپنے ناظرین سے چند ناگزیر وجوہات کی بناء پر کسی قدر تاخیر کی اس مصلحت آمیز مقولہ "دیر آید درست آید" کی سند پیش کرکے معافی کے خواستگار ہیں اور انھیں یقین دلاتے ہیں کہ نقش ثانی نقش اول سے انشاء اللہ بہتر ہی ہوگا۔ جس مقدس فرض اور بے لوث جذبۂ خدمت کی بیقراری دل میں لئے ہم نے میدان عمل میں قدم بڑھایا ہے۔ اس سے کامل یقین ہے کہ ہمارا ہر قدم بقول اقبالؔ آگے ہی کی طرف اٹھیگا۔

ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلّی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

اقبالؔ

مدیر

مسٹر محمد علی جناح کا پیام طلبائے مدرسہ آصفیہ کے نام

بتاریخ ۳۰ ستمبر ۱۹۳۹ء

"ایک زمانہ سے میجر صاحب کا اصرار تھا کہ میں اس مدرسہ کو دیکھوں۔ چنانچہ آج اس کا موقع ملا۔ مین خوش ہوں کہ انھوں نے تفصیل سے اس مدرسہ کا معائنہ کرایا۔

میجر صاحب نے جن الفاظ میں میری تصویر کھینچی ہے اس میں بہت کچھ مبالغہ ہے۔ بہرحال مبالغہ بہت ہو یا کم اگر تصویر اچھی ہے تو میں آپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ آپ اس کی تقلید کریں۔

نوجوانو! ہم اس وقت بہت نازک اور خوفناک دور سے گذر رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ جب وقت آئے گا تو آپ قوم کی خدمت سے پیچھے نہ ہٹینگے۔ میں امید کرتا ہوں کہ تم میں سے بعض ہندوستان کے ہٹلر اور مسولینی بنوگے۔

آخر میں مین خواہش کرتا ہوں کہ تمھارے کام میں ترقی اور کامیابی ہو"

محمد علی جناح

غزل

از

نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل

آج تک دل کی آرزو ہے وہی
پھول مرجھا گیا ہے بُو ہے وہی

سو بہاریں جہاں میں آئیں گئیں
مایۂ صد بہار تو ہے وہی

کھینچ کر تیغ آزما دیکھو
اِن رگوں میں ابھی لہو ہے وہی

پھول لالے کا دیکھ لے اے دل
جو ہے پُر داغ سرخرو ہے وہی

دل کے داغوں پہ اوس کیا پڑتی
وہی گلشن ہے رنگ و بُو ہے وہی

مان لیتا ہوں تیرے وعدے کو
بھول جاتا ہوں میں کہ تُو ہے وہی

گو مجکو ہو چکی ہے رسوائی
کو بکو تیری جستجو ہے وہی

میں سمجھتا تھا دل ہے گھر اُن کا
دیکھتا ہوں تو چارسُو ہے وہی

ہو گئی ہے بہار میں کچھ اور
ورنہ ساغر وہی سبو ہے وہی

لاکھ گر جائیں اشک آنکھوں سے
پھر بھی موتی کی آبرو ہے وہی

میکدے کا جلیل رنگ نہ پوچھ
رقصِ جام و خم و سبو ہے وہی

قصیدہ

مدح اعلحضرت سلطان العلوم خسرو دکن خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ

حضور نیک سیر، شہریار پاک ضمیر
گرہ کشائے خلائق، بخلق عالمگیر

شہنشہان سلف، اور شاہ عثماں میں
وہ فرق ہے، جو ہے انجیل اور قرآں میں

وہ شاہ، جسکی طبیعت میں بردباری ہے
وہ سیر چشم، ادا جس کی انکساری ہے

وہ سادگی! کہ تصدق ہوں جس پہ اہل نظر
وہ کجکلاہی! کہ دنیا کو ناز ہو جس پر

عطا ہوئی ہیں سمجھ کر ہی قدرتیں تجھکو
خدا نے سونپ دیں ہم سب کی قسمتیں تجھکو

جہاں میں طلعت شمس و قمر رہے جب تک
زمیں پہ سکۂ شام و سحر رہے جب تک

دعا ہے شوکت و حشمت تری زیادہ ہو
ترقی عمر میں، دولت تری زیادہ ہو

شریک حال ترے فضل کردگار رہے
ہمیشہ گلشن اقبال میں بہار رہے

مئے نشاط سے لبریز تیرا جام رہے
جہاں میں زندۂ جاوید تیرا نام رہے

بشیر! بس ہے یہ توقیر، کل وقاروں میں
کہ میں بھی ہوں شہ عثماں کے جاں نثاروں میں

بشیر النساء بیگم بشیر

امجد کا پیغام اپنے ہم جنسوں کے نام

ہر شخص کے دل کو خوش کرو عید یہ ہے
ہر چیز کو اچھا کہو تمہید یہ ہے
مخلوق خدا ہے سب خدا کی مخلوق
سب کو ایک سمجھو توحید یہ ہے

امجد حیدرآبادی

غزل

از

نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیزؔ

عیاں یا نہاں اک نظر دیکھ لیتے
کبھی صورت اُن کو مگر دیکھ لیتے

نہ کرتے وفا کے محبت کے شکوے
مرے دل کو بھی وہ اگر دیکھ لیتے

لڑائی میں اِس طرح کی ہے مزا کیا
لڑا کر نظر سے نظر دیکھ لیتے

دھڑکتے ہوئے دل کے ہمراہ میرے
مری نبض بھی چارہ گر دیکھ لیتے

تڑپتے مری طرح تم بھی شبِ غم
تڑپنے کا میرے اثر دیکھ لیتے

مرے پاس یہ بھی امانت ہے انکی
کبھی دل وہ داغِ جگر دیکھ لیتے

نہ آیا شبِ ہجر موقع ابھی تک
ہم آہوں کا اپنی اثر دیکھ لیتے

مریضِ محبت کا دم توڑنا بھی
مزا تھا اگر چارہ گر دیکھ لیتے

نہ پڑھتے نہ پڑھتے بلا سے نہ پڑھتے
مرا خط تو وہ نامہ بر دیکھ لیتے

قفس میں اگر یادِ گلشن کی آتی
تو ہم اپنے زخمِ جگر دیکھ لیتے

عزیزؔ اتنی فرصت بھلا انکو کب تھی
مرا حال وقتِ سحر دیکھ لیتے

رسول اللہ صلعم نے ارشاد فرمایا ہے کہ علم حاصل کرنا ہر مرد مسلم اور عورت کا فرض ہے علم کی فضیلت اور اہمیت ایک اور ارشاد نبوی کے ذریعہ ظاہر ہے کہ "علم کو گہوارہ سے قبر تک حاصل کئے جاؤ"

علم کی دو قسمیں ہیں ۔ ایک سائنس دوسرے علم دین ۔

جبتک ان ہر دو علوم یعنی علم دین اور علم دنیا میں کمال حاصل نہ کیا جائے ۔ انسانی صلاحتین درجۂ کمال تک نہیں پہنچ سکتیں ۔ اور نہ مسلمان اپنے فریضہ سے عہدہ برآ ہوسکتا ہے ۔

مسلمانو! تم ایک بہت بڑے باپ کے بیٹے ہو جس کا نام اسلام ہے ۔

اس کو حیات جاودان عطا کی گئی ہے اور یہ ازلی اور سرمدی زندگی رکھتا ہے لیکن آجکل انسان اپنی فطرت کو بھول گیا ہے ۔ خدا نے انسان کی برتری کے لئے جو قوانین بنائے تھے اس نے انھیں اپنی غفلت شعاری کی وجہ سے نظر انداز کردیا ہے جسکی وجہ سے تمام قسم کی برائیاں ابھر آئیں ۔ جن کی زندہ مثالیں اسپین چین اور پولینڈ وغیرہ کی ہلاکت خیز لڑائیاں ہیں

ان تمام مصائب کو دور کرنے کے لئے تمھیں اپنے دل، دماغ اور جسم سے کام لینا پڑیگا ۔ سب کے ساتھ رواداری اور انصاف سے پیش آنا چاہئے تاکہ تم بھی زندہ رہو اور زندہ رہنے دو" کے زرین اصول پر کاربند ہوں سب سے پہلے ارادہ کو بلند اور مضبوط رکھنا اور کسی غیر الٰہی طاقت سے مرعوب نہ ہونا چاہئے ۔ زندگی پیدا ہوتی ہے ہاتھ پیر کو حرکت دینے سے نہ کہ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے ۔

سوائے خدا کے اور کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلاؤ جو دن میں سے رات اور اندھیرے سے اجالا لاتا ہے اور آنکھوں والوں کی آنکھوں میں مسئلہ توحید کو سمجھاتا ہے ۔

قدیم لاطینی اور ہندوستانی فیلسوف یہ کہتے تھے کہ ہستی سے نیستی پیدا ہوتی ہے لیکن وہ راز جو بڑے بڑے فلسفیوں سے کھل نہ سکا ۔ ایک نبی امی صلعم اس کا انکشاف فرماتے ہیں کہ خدا وہ ہے جو ہست کو نیست اور نیست کو ہست بنا سکتا ہے مسلمانوں کے لئے پہلا فرض خدا پر ایمان لانا ۔ دوسرا فرض رسول اللہ صلعم سے محبت اور تیسرا ان کے احکام کی تعمیل ہے ۔

بس یہی ہماری زندگی اور یہی ہماری زندگی کا سامان ہے ۔ اگر تم اپنی ساری زندگی اس طرح گذاریں گے تو میں یقین دلاتا ہوں کہ تم دنیا میں آفتاب اور مہتاب بن کر چمکو گے ۔ فقط

مولانا ظفر علیخاں

غزل

از

حضرت فانیؔ بدایونی
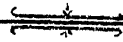
وہ خود اب فریبِ جمال ہے جو نظر تھی جلوۂ یار پر
مجھے اب بہار سے کیا غرض کہ مری خزاں ہے بہار پر

مرے ذوقِ دید کو بجلیاں ہی نصیب ہیں تو یہیں سہی
یہ گناہ ہے تو اٹھا نہ رکھ یہ گناہ روزِ شمار پر

یہ نویدِ گردشِ جام کیا یہ صلائے عیشِ مدام کیا
کہ ہزار لطف کی صحبتیں ہیں نثار اک غمِ یار پر

مرے آشیاں پہ عجب نہیں کبھی برق قصدِ کرم کرے
مگر آہ درخورِ پیش کش نہ وہ مشتِ خس نہ یہ چار پر

وہ مزارِ فانیٔ مبتلا کا نشاں مٹانے کو آئینگے
یہ وعید وعدے سے کم نہیں کہ وہ آئینگے تو مزار پر

ایک گیت ۔ زندگی کے اسٹیج پر تخریبی عناصر کا کورس

از

حضرت جوشؔ ملیح آبادی

طوفان کی جے انسان کی جے
بوجہل کی جے شیطان کی جے

اس دنیا کی کیا ہستی ہے
جھوٹوں کی یہ تو بستی ہے
ہر اوج کے اندر پستی ہے
ہر ہوش میں پنہاں مستی ہے

طوفان کی جے انسان کی جے
بوجہل کی جے شیطان کی جے

جب رات زمیں پر چھاتی ہے
فطرت کی نقاب اٹھ جاتی ہے
انسان کی خباثت گاتی ہے
اس وقت صدا یہ آتی ہے

طوفان کی جے انسان کی جے
بوجہل کی جے شیطان کی جے

اخلاق کی بستی چھوڑ کے چل
اوہام کے سر کو پھوڑ کے چل
ایماں کی کلائی موڑ کے چل
ہر بندِ گراں کو توڑ کے چل

طوفان کی جے — انسان کی جے
بوجہل کی جے — شیطان کی جے

یہ مست فضا یہ مست گھٹا
یہ آتش تر یہ سرد ہوا
اے رُوحِ بغاوت ہوش میں آ
طوفان اٹھا، طوفان اٹھا

طوفان کی جے — انسان کی جے
بوجہل کی جے — شیطان کی جے
شیطان کی جے
شیطان کی جے

سیرت جمال الدین افغانی

میری زیر طبع تالیف "سیرت جمال الدین افغانی" کے یہ چند اوراق ہیں جو میں اپنے نوجوان بھائیوں کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

قاضی عبدالغفار

دوسرا سفر مصر

کہا جاتا ہے کہ قسطنطنیہ سے روانہ ہوتے وقت شیخ کے دل میں سفر حج کا خیال تھا لیکن اب وہ دوسرے حج اکبر کی تیاریوں میں مشغول ہو چکے تھے اور اوسی کے ارادوں کو دل میں لے کر وہ ترکی سے سیدھے مصر آئے۔ جہاں وہ ۲۲ر مارچ ۱۸۷۱ء کو پہونچے۔ اور اوسی تاریخ سے مصر اور دنیائے اسلام کی سیاسی زندگی میں اُن کی شخصیت پوری طرح نمایاں ہو گئی۔ اور اسی نقطہ سے اُن کی شہرت بین الاقوامی اہمیت حاصل کرنے لگی۔

شیخ جس وقت دوبارہ مصر میں داخل ہوئے تو خدیو اسمٰعیل برسر حکومت تھا۔ سلطان ترکی کی سیادت محض برائے نام باقی رہ گئی تھی۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں کے قدم آگے بڑھتے آتے تھے۔ نہر سوئز کا افتتاح ہو چکا تھا اور یورپین سیاست کی یہ سب سے بڑی زنجیر مصر کے گلے میں پڑ چکی تھی۔ اسمٰعیل کی بداعمالیوں نے ملک اور رعایا کو تباہ حال کر دیا تھا جن کے کندھوں پر خدیو کی فضول خرچیوں کا ایک پہاڑ رکھا ہوا تھا۔ اسوقت مصر کا قومی قرضہ ۹½ کروڑ پونڈ تھا اور اپنی حکومت کے ہر سال میں اسمٰعیل اس قرضہ کو ۷۰ لاکھ پونڈ کے اوسط سے بڑھا رہا تھا! فلاحین قحط کے عذاب میں مبتلا تھے یورپ کے سرمایہ دار اور ساہوکار اپنے منافع اور سود کے وصول کرنے کی فکریں کر رہے تھے اور باوجود اُن کے سخت تقاضوں کے اسمٰعیل و والیہ کی فضول خرچیاں کم نہ ہوتی تھیں اس تباہ کن عہد کے آخری (۸) سال شیخ نے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں وہ زمانہ تھا

جب دول یورپ نے یورپین قرضخواہوں کی خاطر قرضہ کی ادائیگی کا انتظام کرنے کے لئے ایک کمیشن مقرر کر دیا تھا۔ اور مصر کی مالی حالت کی نگرانی انگریزوں اور فرانسیسیوں نے اپنے ذمہ لے لی تھی۔ اوس کمیشن کا اصلی مقصد ہی یہ تھا کہ مصر کے محاصل پر دول کا قبضہ قائم ہو جائے اسی زمانہ میں اسمٰعیل نے نہر سوئز کے حصص بھی فروخت کر ڈالے اوس کو سوائے اس کے کسی بات کی فکر نہ تھی کہ خرچ کرنے کے لئے کافی روپیہ کسی نہ کسی طریقے سے ملتا رہے حصص فروخت ہو جانے کے بعد نہر سوئز کے معاملات میں مصری حکومت کا کوئی دخل باقی نہ رہا اور وہ فولادی زنجیر بالکل مکمل ہو گئی جس سے دول نہ صرف مصر کو بلکہ تمام مشرقی ایشیا کو باندھنا چاہتی تھیں۔ بلا شبہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ خدیو اسمٰعیل کی زندگی نہ صرف اپنے لئے بلکہ دوسروں کے لئے اور نہ صرف مصر کے لئے بلکہ غیر ممالک کے لئے بھی ایک لعنت ثابت ہوئی۔ اس طرح ۱۸۷۵ء اور ۱۸۸۰ء کا درمیانی زمانہ مصر کے مصائب کا بدترین زمانہ تھا۔ اور یہی وقت مصر میں شیخ کی جدوجہد کا وقت تھا۔ مصر کے اس دور ابتلا میں شیخ نے مصر کی مظلوم اور خستہ حال رعایا کو مطالبہ حقوق اور عزت نفس کا سبق دینا شروع کیا۔ شیخ کے لئے اوس وقت دنیائے اسلام کی یہ تاریکی ایک زبردست پیام عمل بن گئی۔

وہ دیکھ رہے ہونگے کہ ٹرکی جو ایک زمانہ تک مسلمانان عالم کی نظروں اور امیدوں کا مرکز تھا اب بستر مرگ پر پڑا ہوا ہے۔ روسی فوجیں قسطنطنیہ کے دروازے پر ملت عثمانی کی موت کا نقارہ بجا چکی تھیں برلن میں دول یورپ کی خفیہ کانفرنس اسلامی ممالک اور خصوصاً ترکی اور مصر کی قسمت کا فیصلہ کر چکی تھی۔ قبرس پر برطانوی قبضہ تسلیم کیا جا چکا تھا۔ فرانس کو تونس پر قبضہ کر لینے کی اجازت دیجا چکی تھی۔ شام میں فرانس کے حقوق کو برطانیہ نے تسلیم کر لیا تھا۔ ان حالات میں خدا جانے شیخ کا دردمند دل کس قدر بے چین ہوگا ٹرکی کی طرح مصر میں بھی قومی مصائب اور ابتلا نے قوم پرستوں کی ایک مختصر اور کمزور جماعت پیدا کر دی تھی اور غالباً اسی ایک خفیف شعاع امید کے بھروسہ پر شیخ نے مصر میں کام کرنے کا فیصلہ کیا ہوگا۔ مصر پر دول یورپ کی گرفت اس قدر سخت ہوتی جاتی تھی کہ نالائق اسمٰعیل بھی اوس کو محسوس کرنے لگا تھا۔ اور گھبرا گھبرا کر قوم پرست جماعت سے امداد کا خواہاں ہوا تھا۔ اپنے ملک کو تباہ کر ڈالنے کے بعد اب جو اوس کو کچھ ہوش آچلا تھا تو وہ ہر طرف سے مایوس ہو کر اس فکر میں تھا کہ کم از کم قوم پرستوں کی جماعت کو اپنا معاون بنائے اور آئینی اصلاحات نافذ کر کے اس گرتی ہوئی دیوار کو سنبھالے لیکن یوروپین مدبرین اور ساہوکار بھی غافل نہ تھے وہ جانتے تھے کہ اگر خدیو نے مصری رعایا کو آئینی حقوق دیدئے تو پارلیمنٹ بہت سے قرضوں کی ادائیگی سے انکار کر یگی یا کم از کم ادائیگی میں مزید مشکلات پیدا ہو جائینگے۔ اس طرح اپنے روپیہ کو ڈوبتے ہوئے دیکھکر یوروپین ساہوکاروں نے مصر میں آئینی اصلاحات کا نفاذ روکنے کے لئے انتہائی سیاسی اثرات سے

کا م لینا شروع کیا۔ ان مشکلات میں مصر کی قوم پرست جماعت پھنسی ہوئی تھی۔ اور اس نازک زمانہ میں جمال الدین جیسے داعی کا مصر میں آجانا ایک فال نیک سمجھا گیا۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اگر اوس زمانہ میں شیخ نے مصر میں قومی تحریک شروع کر کے علمائے ازہر اور قوم پرستوں کے اندر ایک نئی روح پیدا نہ کر دی ہوتی تو یقیناً اوسی زمانہ میں مصر کا خاتمہ ہو چکا ہوتا۔ آیندہ سطور میں شیخ کی اوس جد و جہد کو جو انھوں نے مصر میں شروع کی اسی نقطہ نظر سے دیکھئے۔

پہلی دفعہ ۴۰ دن کے مختصر قیام میں شیخ نے جو نقوش مصریوں کے قلوب پر ثبت کئے تھے وہ مٹنے والے نہ تھے۔ اس لئے جب دوبارہ شیخ مصر میں آئے تو ان کو اپنے کام کے لئے بہت کچھ مواد تیار ملا۔ مصر میں داخل ہونے کے چند ہی روز بعد اون کے فضل و کمال کا شہرہ ریاض پادشاہ وزیر اعظم کے کانوں تک پہونچا۔ پہلی ہی ملاقات میں شیخ کی شخصیت نے اون پر اپنا اثر جما لیا کہ خود وزیر اعظم کی طرف سے اصرار کیا گیا کہ شیخ زیادہ عرصہ تک مصر میں قیام فرمائیں۔ دوسری طرف طلبائے ازہر کی جماعت متمنی ہوئی کہ شیخ مصر میں مستقل قیام کا ارادہ کر لیں۔ خدیو نے بھی ریاض پاشا کی تحریک پر شیخ کے لئے ہزار غروش مصری ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا جو بقول براؤن "کسی خاص خدمت کے معاوضہ میں نہیں بلکہ محض ایک معزز مہمان کی عزت افزائی کی غرض سے" مقرر کیا گیا تھا۔

اپنا سجادہ بچھاتے ہی شیخ نے سب سے پہلے ازہر کی طرف توجہ کی۔ وہ خوب سمجھتے تھے کہ اون کی تحریک اگر ازہر میں کامیاب ہو گئی تو گویا سارے ملک میں کامیاب ہو گئی۔ ایک طرف تو وہ علما کی طاقت کو شریک حال کر کے اوس سے کام لینا چاہتے تھے۔ اور دوسری طرف اون کی نظر مصر کی نئی نسل پر جمی ہوئی تھی جو ازہر کے مصلوں کے گرد جمع تھی۔ اپنی سیاسی جد و جہد میں ہر جگہ شیخ نے علما اور نوجوان نسل سے کام لینے کی کوشش کی اور ایران میں تو اونکی کامیابی کا اصلی راز ہی یہ تھا۔

ازہر میں شیخ کی زندگی کی جو تفصیلات حاصل ہو سکیں وہ بہت دلچسپ ہیں شروع شروع میں وہ جامعہ کے اندر ہی درس دیا کرتے تھے لیکن بعد کو طلبا اون کے مکان پر جمع ہونے لگے۔ اس وقت ازہر کا نصاب تعلیم وہی قدیم نصاب تھا جو زمانہ کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں اور لوگوں کی بدلتی ہوئی ذہنیت سے بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ جدید علوم کی تعلیم ایک بدعت سمجھی جاتی تھی۔ اور مغربی علوم کی روشنی کے لئے تمام راستے بدستور بند رکھے گئے تھے۔ شیخ نے سب سے پہلے بو علی سینا کی کتابیں نصاب میں داخل کرائیں۔ اور اون کا درس دینا شروع کیا۔ اسی کے ساتھ وہ فلسفہ اور علم الافلاک اور تصوف پر بھی لیکچر دیتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اوس زمانہ میں شیخ کے شاگرد اون کے خطبات اور لیکچروں کا ایک ایک حرف قلمبند کر لیا کرتے تھے۔ افسوس ہے کہ وہ خزانہ اب نایاب ہے۔

باوجودیکہ ازہر میں شیخ بہت ہر دلعزیز تھے مگر پھر بھی بعض قدامت پسند علماء اونکی ان "بدعتوں" کو ہضم

کرنے کی اہلیت نہ رکھتے تھے اور اکثر اون کے طرز عمل پر اعتراضات کرتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ جب وہ جغرافیہ کا
سبق پڑھانے کے لئے ایک مصنوعی کرہ ارض کو مسجد میں ساتھ لے گئے تاکہ طلباء کو زمین کی گردش اور شکل آسانی
سمجھا سکیں تو بعض "بزرگان دین" بہت چین بہ چین ہوئے لیکن اس قسم کی رکاوٹوں کی پروا نہ کرکے شیخ اپنا کام
کئے جا رہے تھے۔ ایک نئی دنیا تھی جو وہ اپنے شاگردوں کے سامنے پیش کر رہے تھے۔ ایک ایسی نئی دنیا
جس سے ازہر کی قدامت پرست اساتذہ بالکل آشنا نہ تھے!! اوس زمانہ میں عام مذہبی ذہنیت کی اصلاح کے
متعلق جو مطمح نظر اون کا تھا اور جو کام انھوں نے کیا اوس کی حقیقت اون کے دوست ملنیٹ کی زبان سے سننے
کے قابل ہے۔ ملنیٹ لکھتا ہے کہ:۔

"گذشتہ دو سو برس میں بہت سے ایسے واعظ گذرے ہیں جنہوں نے ہمیشہ یہ تلقین کی کہ اسلام کے تنزل کا
بڑا سبب یہ تھا کہ مسلمانوں نے شریعت اسلامی کی اوس طرح پابندی نہیں کی اور اسلام کی قدیم سادہ روایات
کا وہ احترام نہیں کیا جو ابتداد اسلام میں شعار اسلامی تھا۔ علاوہ بریں ترکی اور مصر میں ایسے مصلحین پیدا ہوئے،
جنہوں نے محض سیاسی اغراض کے لئے حکومت کا یورپین نقشہ بنایا مگر ان مصلحین نے جو اصلاحات نافذ کیں وہ
گویا بہ جبر نافذ کی گئیں، شاہی احکام کے ذریعہ سے یا عقلا کو مجبور کرکے۔ مگر کبھی کوئی کوشش ایسی نہیں کی گئی کہ ان
اصلاحات کو قرآن اور حدیث کے مطابق ثابت کیا جاتا۔ گویا اس طرح سیاسی اصلاحات ہمیشہ طبقہ اعلیٰ کی طرف سے
حکماً نافذ کی گئیں اور عوام کے دلوں میں اونکی جگہ پیدا نہ ہوسکی۔ جمال الدین کی ذہانت وجدت یہ تھی کہ اونھوں نے
اسلامی ممالک میں مغربی خیالات رکھنے والوں کی ذہنیت کی اصلاح کرنے کی کوشش کی اور اس امر کی تبلیغ و
تلقین کی کہ اسلام کے موجودہ حالات پر نظر ثانی کی جائے۔ اور بجائے ماضی سے لپٹے رہنے کے جدید علوم کے ساتھ
پرانی ذہنیت کے بدلنے کی تحریک کو آگے بڑھایا جائے۔ قرآن و حدیث سے اونکی وسیع واقفیت نے اون کو
اس کا موقعہ دیا کہ وہ یہ بتائیں کہ اگر قرآن و حدیث کے صحیح معنی پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ درحقیقت اسلام کے
اندر وسیع تغیرات کی گنجائش موجود ہے اور مشکل سے کوئی آئینی اور سیاسی اصلاح ایسی ہوگی جو شریعت کے خلاف ہو۔
مصر میں شیخ نے اس حقیقت کو اچھی طرح واضح کیا کہ اسلام ہر زمانہ میں انسانوں کی تمام ضروریات کا
کفیل ہونے کے قابل ہے۔ اور عہد جدید کی تمام ضروریات کو پورا کرسکتا ہے...... علماء کے تخیل و ضمیر کو وہ اون
زنجیروں سے آزاد کرنا چاہتے تھے جن میں یہ لوگ صدیوں سے جکڑے پڑے تھے اور بتانا چاہتے تھے کہ اسلام
ایک مردہ قالب نہیں ہے البتہ اوس کے اندر آئینی لچک ہے کہ وہ ہر زمانہ کی بدلتی ہوئی ضروریات کا کفیل ہوسکتا
ہے........ لیکن یہ کس قدر تعجب کی بات ہے کہ مغرب میں اصلاح کی اس تحریک کا آغاز ایک ایسے
شخص سے ہوا جس نے وسط ایشیا کے جمود میں پرورش پائی تھی اور پھر کسقدر تعجب ہے کہ یہ اصلاحی تحریک

وہ دور از دارالعلوم ازہر میں شروع ہوئی .... مصر کی اس ذہنی اور اخلاقی تاریکی کی حالت میں جمال الدین کی تعلیمات ایک عجیب روشنی لیکر ہویدا ہوئیں ...."

شیخ کے شاگردوں کے اقوال سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ان کی تعلیمات نے کسقدر گہرے اثرات پیدا کئے تھے۔ تلامذہ کی فہرست میں ایسے مشہور لوگوں کے نام ہم پاتے ہیں جیسے کہ محمد بیک مویلحی ابراہیم بیک مویلحی مفتی عبدہ ادیب اسحق شیخ ابراہیم الاغانی جو سب دنیائے علم و فضل میں بہت محترم اور مفتخر تھے۔ اس میں شک نہیں کہ شیخ کے ارشد تلامذہ مفتی عبدہ تھے جو بعد کو مصر کی قومی تحریک میں شیخ کے جانشین قرار پائے اور جنھوں نے شیخ کے مصر سے چلے جانے کے بعد اونکی مشعل ہدایت کو روشن رکھا۔ مفتی عبدہ کے الفاظ سے شیخ کی تعلیمات کی اہمیت اور اثرات کا اندازہ ہوتا ہے۔

"این مفتی مشہور عصر در یک مقالہ خودمی گوید کہ پیش از دیدن جمال الدین افغان گویا چشم کور گوشم کر و زبانم لنگ بود" ؎

اسی طرح ادیب اسحق جو مصر کے نامور اہل قلم تھے شیخ کے متعلق اپنے احساسات کو یوں ظاہر کرتے ہیں:۔

"چیزے کہ من میدانم ہمہ آں از جمال الدین افغان آموختہ ام"

اسی طرح شیخ کے سترکار کارکنان اور معاونین میں ایک بڑی جماعت ازہر کے نوجوانوں کی تھی جن کے جوش عمل نے چند روز میں مصر کی قومی زندگی کا نقشہ بدل ڈالا۔ شیخ ان لوگوں میں سے نہ تھے جو صرف علمی صحبتوں میں خاموش بیٹھے رہتے تھے انکی فطرت پارہ کی طرح بیچین تھی۔ اور ان کی نظر بہت دور تک جاتی تھی وہ خاموش رہکر دھیمی رفتار سے کام کرنے والے آدمی نہ تھے ان کا سمندر ہر وقت ایک طوفان مانگتا تھا۔ اور اُن کا بیقرار دل جلد سے جلد نتائج طلب کرتا تھا۔ منزل کی دوری کے احساس سے اُن کا دل بیگانہ تھا۔ رفتار کی سُستی اون کو گوارہ نہ تھی حق کے مقابلہ میں باطل سے اون کا سمجھوتہ ممکن نہ ہوا۔ اعتدال اون کے نزدیک بزدلی کا دوسرا نام تھا لہجہ کی نرمی اور عمل کی سستی کو وہ ارادوں کی کمزوری سمجھتے تھے۔ اس لئے محض ازہر کے مصلے پر بیٹھے رہنا اور سبق پڑھانا ان کے لئے کچھ دلچسپ کام نہ تھا وہ اس مصلے سے چند روز بعد ہی اوٹھ کھڑے ہوئے اور اونھوں نے ملک میں ہر قسم کی جماعتیں اور انجمنیں قایم کرنی شروع کیں جن میں سے اکثر کے مقاصد کھلے طور پر سیاسی تھے۔ اونکی قائم کی ہوئی سب سے بڑی انجمن وہ تھی جو انجمن حیات الوطنی" یا "طفل وطنی" کے نام سے مشہور ہے۔

؎ جریدہ مصورہ مطبوعہ شہباسیا استانبول۔

دیہات سدھار

مس پدمجا نائیڈو

۹ ستمبر ۱۹۳۹ء

شہری زندگی عام طور پر راگ ورنگ کی زندگی ہوتی ہے جہاں نت نئے فیشن بدلتے اور طرح طرح کے دولت کے کھیل کھیلے جاتے ہیں۔ برخلاف اس کے ہم شہروں کے رہنے والے بہت کم اُن غریب بے زبان کسانوں کی حالت کا اندازہ کرسکتے ہیں جو فاقہ، جہل اور غریبی کے جہنم میں جلتے اور ہماری ہانڈی تیار کرنے کے لئے خود ایندھن کا کام دیتے ہیں۔ بہت دور نہیں کسی شہر سے صرف تیس یا بتیس میل ہی کے فاصلہ پر چلے جائیے تو آپ کو ان بے شمار بندگانِ خدا کی حالت کا بخوبی اندازہ ہوگا جو اپنی ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیوں میں جن کو ایک تیز و تند ہوا کا جھونکا بھی ڈھا سکتا ہے۔ نیم برہنہ حالت میں اپنے جیون کے دن کاٹ رہے ہیں۔

کیا وہ زرد اور خوفناک ہڈیوں کے ڈھانچے جن میں سے آنکھیں غمگین روحیں جھانکتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ ہماری نیندیں حرام نہیں کردیتیں؟ کیا ہم شہریوں کا یہ فرض نہیں ہے کہ اپنی فرصت کی چند ساعتیں اُن میں بسر کرکے اُن کی عام حالت کو درست کرسکیں تاکہ وہ ایک شائستہ قوم کے کارآمد دست و بازو بن کر ہماری قومی مشن کو آسانی سے چلانے میں مدد دیں؟

اس کا جواب خود ہمارے ملک کے نوجوان دے سکتے ہیں!

(آزاد ترجمہ) مدیر

یہ اُن فاضلانہ خیالات کا آزاد ترجمہ ہے جن کا اظہار مس موصوفہ نے بتاریخ ۹ ستمبر ۱۹۳۹ء کو درسگاہ ہٰذا کی بزم ادب انگریزی کے افتتاحی جلسہ میں کیا تھا۔

عطائے شاعر

از

حضرت علی اختر

دِل و چشمِ بینا عطا کر رہا ہوں
حقائق کی دُنیا عطا کر رہا ہوں

زمانے کے ہر خار و خس کی جبیں کو
محبت کا سجدہ عطا کر رہا ہوں

وہ حُسنِ خود آرا کہ ہے رازِ ہستی
وہ حُسن خود آرا عطا کر رہا ہوں

اِن اجزائے ہستی کی بیچینیوں کو
مزاجِ شکیبا عطا کر رہا ہوں

پُرانے ہوئے ظرف میخانہ ساقی!
نئے جام و مینا عطا کر رہا ہوں

جو کوہِ گراں کی جڑوں کو ہلا دے
وہ دِل، وہ ارادہ عطا کر رہا ہوں

جو خود حُسنِ پنہاں کو بیچین کر دے
وہ ذوقِ تماشا عطا کر رہا ہوں

جوانی، محبت ـ محبت جوانی
بقدرِ تمنّا عطا کر رہا ہوں

قدم لے رہے ہیں جہانِ خرابی
مئے حُسن و نغمہ عطا کر رہا ہوں

زمانے کو اب چاہئے کیا کہ اختر
محبت کی دنیا عطا کر رہا ہوں

سیاح کی ڈائری کے چند اوراق

میدان واٹرلو کی سیر

از
جناب مولوی عبدالرحمن خاں صاحب سابق صدر کلیہ جامعہ عثمانیہ (بیگم پیٹھ)

ستمبر ۱۹۱۲ء

ہم کو اس کمرہ میں پہنچا یا گیا جو ولنگٹن کی خواب گاہ رہ چکا ہے اور جس میں اس نے ۱۵ ؍ جون کی شب کو ڈیسیہ رچمنڈ کی قیامگاہ برسلیز کی منعقدہ محفل رقص سے آکر آرام کیا تھا۔

جیسا کہ ہر شخص واقف ہے، بیرن نے اپنی نظم (childs harolds pilgrimage) کے ذریعہ جس کا عنوان (The eve of waterloo) یعنی واٹرلو کی شام" ہے اس محفل رقص کو لافانی بنا دیا۔ اگرچہ کہ بیرن فی الحقیقت ۱۶ ؍ جون (quatre Bras) کی لڑائی کے قابل یادگار واقعہ کو بیان کرتا ہے جس میں سیاہ اہل (Bruns wikers) نے فریڈرک ولیم امیر (Bruns wick) کی قیادت میں مارشل (Ney) کے برق آسا حملوں کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور جہاں برطانوی شجاعت اور استقلال نے بلجیم کے بزدل (Hussars) کا راستہ مسدود کر دیا تھا۔

تھیکرے، ناول نویسوں کے مخصوص انداز میں اپنی ناول (Vanity Fair) کے ذریعہ اس محفل رقص کا شاعرانہ نقشہ کھینچا ہے اور عالمانہ تفصیل کے ساتھ (george osborne) کی بیگم (Amelia) کے ساتھ بدنیتی اور بیوفائی کا ذکر کرتے ہوئے (samey Rebecca) کی سازش کو بیان کیا ہے۔ یہانتک کہ وہ کپتان (Dobbim) کی مدد سے کانا پوسی کے ذریعہ ہوش میں لایا جاتا ہے۔

"غنیم (samere) سے گزر گیا۔ ہمارا دایاں بازو پہلے ہی سے مصروف عمل ہے چلے آؤ ہمیں تین دن میں کوچ کرنا ہے۔"

خوابگاہ ایک دلچسپ عجائب خانہ کا کام دیتی ہے۔ راہبر نے کامل صحت کے ساتھ اس فرنیچر کا معائنہ کروایا جسے ولنگٹن نے اپنے لئے استعمال کیا تھا۔ اس کے علاوہ بہت سے ایسے اسلحہ جات بھی دکھلائے جو محاربہ عظیم کے بعد لگے رہتے اس کے بعد سیاحوں کی ٹولی (Mont St. Jean) کے مزرعہ کے پاس پہنچی۔ جہاں ولنگٹن سے متحدین کے لئے

کے لئے موقتی میدانی دواخانے نصب کر دیئے گئے ۔ اُس وقت برطانوی فوج کا بڑا حصہ مزرعہ اور (Chainbay) کے درمیان خندقوں میں متعین تھا۔ ان ہی میں سے ایک دواخانہ میں امیر ولنگٹن کا مصاحب خاص لفٹنٹ کرنل الگزنڈر منتقل کیا گیا تھا جس کا پاؤں امیر موصوف کے احکام کی بجا آوری میں دشمن کے توپ کے گولہ کی نذر ہوگیا تھا ۔ جنگ کے دوسرے روز اس نے اس دواخانہ میں اس دار فانی سے رحلت کی ۔ جبکہ ڈیوک آف ولنگٹن اپنی فتح و کامرانی کی اطلاع کا مسودہ مرتب کر رہا تھا ۔

یاد رہے کہ قابل یادگار سو دن جس عرصہ میں نپولین (Elba) سے فرار ہوا ۔ سوائے فرانس کے (قدیم شاہ پرست شامل نہیں تھے) تمام یورپ اس کے خلاف تیغ بکف تھا ۔ اس کے لئے نجات کا واحد موقع یہی تھا کہ امیر ولنگٹن کی قیادت سے متحدین کی اُن فوجوں کو اتحاد و اشتراک سے باز رکھے ۔ جو برڈسیلز کے آگے تھیں اسکے علاوہ (Blucher) کی فوج کے ایک بڑے حصہ کو بھی روکنا تھا جو اشتراک کو موثر بنانے کیلئے کوچ کر رہا تھا ۔ اگر وہ یکے بعد دیگرے دونوں کو شکست فاش دیتا تو پرشیا اور آسٹریا کی جرار فوجوں کی طرف فرصت سے متوجہ ہونیکا اُس کو موقع ملتا ۔ کیونکہ اس کے نزدیک انکی جنگی کارکردگی کی کوئی قدر و منزلت نہ تھی ۔ سرعت رفتار کے ساتھ کوچ کرتا ہوا ۔ اپنی فوج کے دو تہائی حصہ کو اہل پرشیا کی سرکوبی کے لئے مامور کیا ۔ اس کے برخلاف برطانوی افواج (B-Lords) کے قریباً ایک ثلث حصہ کیساتھ عہدہ برآ ہونے کے لئے کافی تھیں لیکن پرشیا کی فوجوں کو خاطر خواہ شکست دینے کے قابل نہیں تھیں ۔ نپولین کے لئے درست چارہ کار یہ تھا کہ یا تو وہ پرشیا کی فوجوں کی سرکوبی کرے یا اپنی تمام فوج سے ولنگٹن پر حملہ آور ہو لیکن اس موقع کو اس نے کھو دیا اور متحدین کی فوجیں بغیر کسی نقصان کے بچ نکلیں ۔

برطانیہ اور پرشیا کی فوجیں واٹرلو اور (Wavre) کی طرف ہٹ گئیں ۔ نپولین نے اپنی فوج کے ایک تہائی حصہ کو اہل پرشیا سے لڑنے کے لئے مقرر کیا ۔ اور دو تہائی حصہ ولنگٹن کے مقابلہ کے لئے مختص کر دیا ۔ ولنگٹن نے بھی کسی نہ کسی طریقہ سے اپنی فوجوں کی تنظیم کی تاکہ اس کے آزمودہ سپاہی آگے بڑھکر آئیں اہم مقامات پر قبضہ جمانے کے قابل ہو جائیں ۔ یعنے The chateau of hougoumont اور دو مختلف النوع زراعتی عمارات جو ایک تنگ وادی کی ڈھلان پر واقع ہے اور فوج کا خاص حصہ پہاڑی نما میدان کے عقب میں پڑاؤ ڈالا ہوا تھا ۔ اس کے زدن قیام کی بدولت ولنگٹن نپولین کے تمام حملوں کو روکنے کے قابل تھا ۔ یہاں تک کہ (Blucher) جس نے اپنی قوم کا ایک چوتھائی حصہ (Grouchy) کے مقابلہ کے لئے چھوڑ گیا تھا ۔ دوسرے تین ڈویژن کے ساتھ اس کی کمک کے لئے آپہنچا ۔ اور اپنی فوجوں کو ولنگٹن کے دائیں بازو کی جانب زاویہ قائمہ کی صورت میں ترتیب دیا ۔ اس طرح دونوں فوجوں کو یہ ایک وقت لڑنے پر مجبور کیا ۔ نپولین نے برطانوی فوجی خط تنظیم کو توڑنے کی ناکام کوشش کی لیکن برطانوی محافظی دستوں کے استقلال کی وجہ سے اُسے قلب میں پسپا ہونا پڑا ۔ اور اسوقت جبکہ یہ واقعہ ظہور پذیر ہوا ۔ پرشیا کی فوجوں نے اس کے خط پسپائی پر قبضہ جمالیا یہاں تک کہ اسکی فوج بری طرح منتشر ہوگئی اور تقریباً تمام مال و اسباب اور توپ خانہ پر متحدین کا قبضہ ہوگیا ۔ نپولین اولاً پیرس کی طرف فرار ہوا (Rochefort) جہاں اس نے اپنے آپ کو ایک برطانوی کپتان کے سپرد کر دیا ۔ (ترجمہ) سید عابد علی بی ۔ اے (عثمانیہ)

از

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب ایم اے۔ پی ایچ۔ ڈی (ہائیڈلبرگ) صدر شعبہ فلسفہ کلیہ جامعہ عثمانیہ

دنیا ہے حقیقت کا سایہ — اور ہر سایہ ہے بے مایہ

سائے کو تو کیسے پکڑے — موہوم کو تو کیسے جکڑے

تو اس کے پیچھے گر بھاگے — یہ بھاگیگا آگے آگے

مُنہ موڑ کے گر تو جائے گا — یہ پیچھے پیچھے آئے گا

دُنیا طالب سے اکڑتی ہے — تارک کے پیچھے پڑتی ہے

تو رُخ خورشید کی جانب رکھ

مہرِ جاوید کی جانب رکھ

ترکی میں تعلیمی اور صنعتی ترقی

از
جناب یار ولی خان صاحب شیروانی، ایم۔ اے بار ایٹ لا، صدر شعبہ تاریخ کلیہ جامعہ عثمانیہ

تعلیمی ترقی

ترکی میں ابتدائی تعلیم سات سال کی عمر سے دس سال کی عمر تک لازمی ہے۔ اس عمر میں لڑکے اور لڑکیاں ایک ساتھ تعلیم حاصل کرتے رہتے ہیں۔ دس سال کے بعد اعلیٰ تعلیم یعنے یونیورسٹی کی تعلیم تک مخلوط تعلیم نہیں دیجاتی بلکہ خانگی طریقہ پر علیحدہ علیحدہ تعلیم دیجاتی ہے پھر جامعاتی تعلیم مخلوط طریقہ پر دیجاتی ہے۔

ترکی میں تعلیم کی ترقی مدارس کے ذریعہ نہیں ہوئی بلکہ ایک اور طریقہ سے ہوئی جس کو "خلق ایوی" کہتے ہیں۔

"خلق ایوی" ایک خاص قسم کے تفریحی اور تعلیمی اداروں کو کہتے ہیں جنکی ابتداء ۱۹۳۳ء میں ہوئی۔

جنگ عظیم سے قبل ترکی میں ۸ فیصدی تعلیم یافتہ اشخاص تھے۔ اور اب ۶۰ فیصدی ہیں۔ اس عظیم الشان تعلیمی ترقی کا سہرا ایک حد تک انہیں "خلق ایوی" اداروں کے سر ہے۔

"خلق ایوی" ہر صوبہ کے صدر مقام پر قایم کئے گئے جنکی تعداد ۱۹۳۳ء میں ۱۶ تھی اور اس وقت ۲۵۰ تک پہنچ چکی ہے۔

تعلیم کی اہم شاخیں (۱۰) قرار دیگئی ہیں جن میں سے چند یہ ہیں۔

(۱) تاریخ (۲) فنون لطیفہ (۳) ڈرامہ (۴) زبانیں (۵) سائنس (۶) عوام کے گیت (FOLKLORE)

متذکرہ علوم کی تعلیم "خلق ایوی" کے ذریعہ خاص طور پر دیجاتی ہے۔ سال گذشتہ ۶ لاکھ افراد نے ان اداروں سے استفادہ کیا اور ممبروں کی تعداد ایک لاکھ تھی۔

ترکی میں "خلق ایوی" کو اس قدر اہمیت حاصل ہے کہ بڑے بڑے علماء و فضلاء اور یونیورسٹیوں کے پروفیسر اس میں تقریر کرنے یا درس دینے کو اپنے لئے باعث فخر و مباہات تصور کرتے ہیں۔

یہ "خلق ایوی" دراصل ایک "کلب گھر" کے مماثل ہے جس کے صدر کا انتخاب خود اراکین کرتے ہیں۔ اس قسم کے ادارہ جات کا کوئی چندہ مقرر نہیں ہے۔ صرف قلیل امداد گورنمنٹ دیتی ہے باقی میونسپلٹی اور دوسرے

مقامی اداروں کی اعانت سے یہ چلتے ہیں۔ "خلق ایوی" میں مقامی تاریخ، زبان، صنعت و حرفت اور اس کے امکانات پر مباحث ہوتے ہیں۔ اور اس کے تحت ایک نوادرخانہ بھی ہوتا ہے۔

ترکی میں ایک خاص چیز یہ ہے کہ وہاں بڑے بڑے شہروں میں خیراتی انجمنیں ہیں جن کی جانب سے ہر ماہ دو ماہ میں غرباء کو عصرانے اور عشائیے دیئے جاتے ہیں۔ یہ عصرانے وغیرہ شہر کے پاس تعطیل کے دن ہوا کرتے اور اس طرح غرباء کے لئے بھی وہی ماحول پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جو امراء کو میسر ہیں۔ ترکی میں تعلیم کا مقصد نظریہ سازی نہیں ہے بلکہ میدان عمل کے لئے افراد تیار کرنا ہے۔ اس نقطہ نظر کے تحت ترکی مدارس میں تعلیم پر کوئی خاص بار نہیں ڈالا جاتا۔ بڑے بڑے امتحانات بھی زبانی ہوتے ہیں۔ صرف دو یا تین مضامین کا امتحان پرچوں کے ذریعہ لیا جاتا ہے۔

ترکی میں اپنی زبان کو خاص اہمیت ہے۔ یہ لوگ غیر زبانوں کی تحصیل کرتے ضرور ہیں لیکن اس لئے کہ اُن زبانوں کے علوم و فنون کو اپنی زبان میں منتقل کریں۔ وہاں اپنی زبان کا وقار اس درجہ ہے کہ اگر کسی مدرسہ یا جامعہ میں کوئی شخص غیر زبان میں تقریر کرتا ہے تو دوسرا شخص بہ حیثیت ترجمان اُن خیالات کو اپنی زبان میں بیان کرتا ہے۔ اس سے ان کی قومی خودداری کا پتہ چلتا ہے۔

صنعتی ترقی صنعتی تنظیم کے ضمن میں ترکوں کو بڑی دقت پیش آئی۔ اس وجہ سے کہ صنعت و حرفت پر جس قدر سرمایہ صرف ہوا کرتا تھا وہ سب یورپ کا تھا جس کی بناء پر ترک صنعتی فائدوں سے محروم رہتے تھے۔ اِن مالی دشواریوں کا انسداد ترکوں نے اِس طرح کیا کہ ایک بنک موسومہ "سومیر بنک" قائم کیا۔ اور جس کی تقریباً (۴۰۰) شاخیں ملک میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اس بنک کا واحد مقصد صنعتوں کی ترقی و احیاء ہے ہر شاخ کی ملکی صنعت اور ترقی وغیرہ کا مواد صدر بنک میں محفوظ رہتا ہے۔

اِس وقت ترکی میں بنکوں کا ایک جال بچھا ہوا ہے۔ جن کا صرف یہ مقصد ہے کہ وہ ملک کی صنعتی ترقی میں ممد و معاون ہوں۔

سنہ ۱۹۳۴ء میں ایک پنجسالہ اسکیم (سنہ ۱۹۳۴ء تا سنہ ۱۹۳۹ء) شروع کی گئی جو تین حصوں پر مشتمل تھی۔

(۱) پارچہ بافی (۲) کیمیائی اشیاء کی تیاری (۳) شیشہ سازی۔

اِس اسکیم کا منشاء یہ تھا کہ ملکی ضروریات ملکی صنعت و حرفت کے ذریعہ مکمل طور پر بہم پہونچائی جائیں اور ملک دوسروں کا دست نگر نہ رہے۔ ترکی میں تمباکو، نیشکر، روئی کی کاشت اور شیشہ سازی کی صنعت پر خاص طور سے زور دیا جارہا ہے۔

دوسری پنجسالہ اسکیم جو سنہ ۱۹۴۰ء سے شروع ہونے والی ہے اس میں حسب ذیل چیزوں پر توجہ کیجائیگی۔

(۱) بجلی (۲) توپ بندوق و اسلحہ سازی وغیرہ۔ ایک بڑا کارخانہ قیصریہ میں ہوائی جہازوں کا قایم کیا گیا ہے۔

صنعتی تعلیم کے لئے (۹) مدارس قایم کئے گئے ہیں سب سے بڑی جنگی تعلیم گاہ انقرہ میں ہے۔ ایسے تمام مدارس میں (۱۲ تا ۱۸) برس کی عمر تک کے طلباء تعلیم پاتے ہیں۔ کوشش کی جاتی ہے کہ ہر طالب علم کسی ایک فن میں ماہر ہو۔ اِس وقت اِن مدارس میں تقریباً دو ہزار طلباء زیر تعلیم ہیں۔ بڑے بڑے صنعتی کالج کوئلے کی کانوں کے قریب بلحاظ سہولت قایم کئے گئے ہیں۔ انقرہ میں ایک مدرسہ زراعت بھی ہے۔ تمام ملک میں فی الوقت (۷۴۴۸) طالب علم جامعاتی طبقہ میں پڑھنے کے قابل ہیں۔

توقع ہے کہ مستقبل قریب میں یہ طلباء ملک کی ترقی میں ممد و معاون ہونگے۔ مختصر یہ کہ اِس نئی جمہوریت میں جو امور جاذب نظر ہیں وہ یہ ہیں۔

(۱) علم کا شوق (۲) ترقی حرفت (۳) ترقی زراعت (۴) ملکی مصنوعات اور زبان کی قدر و قیمت۔ یہ سب چیزیں اِس قومی خودداری اور وقار کی تہہ میں نظر آتی ہیں جنکی وجہ سے ترکوں کو از سر نو سیاسی حیات حاصل ہوئی ہے۔

اِس نئے دور میں ترکی نے اپنی تعلیم کی بنیادیں صحیح اصول پر مستحکم کر لی ہیں اور عملی کام کو مقدم قرار دیا ہے مخلوط تعلیم چونکہ صرف ایسی عمر میں دیجاتی ہے جس میں ہر لڑکا، ہر لڑکی کو اپنی بہن اور ہر لڑکی، ہر لڑکے کو اپنا بھائی سمجھتی ہے کسی طرح قابل اعتراض نہیں سمجھی جا سکتی بلکہ مفید ہے۔ تعلیم کی تعریف ہرگز یہ نہیں ہے کہ کسی چیز کو باہر سے طلباء کے دماغوں کے اندر داخل کیا جائے بلکہ متعلمین کے ذہنی اور دماغی قویٰ کو شگفتہ و شاداب کرنا تعلیم کا حقیقی مقصد ہے اور اِسی پاکیزہ اصول کو انھوں نے اپنی تعلیم کا نصب العین قرار دیا ہے۔ دوستی، محبت، وفاشعاری، دلی ہمدردی، اِس زمانہ میں بھی ترکوں کی خاص خصوصیات ہیں۔

اُن میں ایثار، صداقت اور حب الوطنی بدرجہ اتم موجود ہے اور میرے خیال میں اُن کی ترقی کے راز اِن ہی چیزوں میں ہیں۔

جب تک کہ کسی قوم میں یہ خوبیاں پہلے سے موجود نہ ہوں یا پیدا نہ کی جائیں تو بڑی سے بڑی ہستی یا بہتر سے بہتر مواقع اِس کو ترقی کی راہ پر دیر تک نہیں چلا سکتے۔

لکھی ہے سرِ صبح ستاروں کے لہو سے
شب نے کبھی ناکام تمنا کی کہانی

دریا کے دھڑکتے ہوئے دل کا ہے فسانہ
موجوں کی کشاکش میں حبابوں کی روانی

دن رات کی اس گردشِ پیہم کے اثر سے
ہر روز شفق کرتی ہے خونابہ فشانی

اک کیفیتِ غم ہی کو کہتے ہیں مسرت
احساس کا دھوکا ہے غمِ عشرتِ فانی

شبنم کی تمنا کا جنازہ ہے جنازہ
پھولوں کی جبینوں سے ڈھلکتا ہوا پانی

اِک پل بھی نہیں فطرتِ مجبور سے آزاد
مجروحِ غمِ دہر ہے ماما ہو کہ رانی

اک آن میں پامالِ ستم ہائے خزاں ہے
کلیوں کا لڑکپن ہو کہ پھولوں کی جوانی

کونین میں ہے جبرِ مسلسل کی خدائی
اے قادرِ خلاق! دہائی ہے دہائی

نفسیات مبتدیوں کیلئے

از

ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب
یم اے، پی ایچ ڈی (لندن) بیرسٹرایٹ لا۔ استاذ فلسفہ، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

(۱) فکرِ صحیح

اے تازہ جواں بشنواز ایں پیر کہن — یک نکتہ کہ ہست مایۂ مغز سخن !

زندگی کی ہا جیت علم وجہل کا معاملہ ہے، ایں بردن و باختن زعلم وجہل است ! اور علم وجہل میں خیالات یا تصورات ہی سے سروکار ہے۔ ہر شخص اپنے ہی خیالات کے تار و پو میں الجھا ہوا ہے، افکار و اوہام میں بندھا ہوا ہے اس کی موجودہ حالت نتیجہ ہے۔ اس کے ان جملہ خیالات کا جن پر وہ ماضی میں غور و فکر کرتا رہا ہے۔ اِن ہی خیالات کے تغیر سے اس کی زندگی میں تغیر پیدا کیا جا سکتا ہے۔ نقطۂ نظر کے بدلنے سے زمین و آسمان بدل جاتے ہیں ! حیاتِ طیبہ نتیجہ ہے فکرِ صحیح کا، ان کے درمیان علت و معلول کا تعلق ہے،

فکرِ صحیح کا پہلا قدم نہایت آسان ہے۔ یہ ایک سلبی یا تخریبی خیال کے بجائے ایجابی یا تعمیری خیال کا رکھنا ہے مثلاً "محبت زندگی ہے اور نفرت موت" لہذا بشارت آموز زندگی کا راستہ یہ ہے کہ نفرت، انتقام، بغض و عداوت کے خیالات کو محبت، احسان، خیرخواہی، عفو و رحم سے بدل دیا جائے۔ اگر ہم سب صرف اتنی ہی چیز پر عمل کرنے لگیں تو یہ دنیا جو ہمیں دوزخ کا نمونہ نظر آتی ہے جنت میں تبدیل ہو جائے ! اور سچ تو یہ ہے کہ جو لوگ علم صحیح کے حامل ہیں اور ضبط نفس پر قادر ان کے لئے دنیا اب بھی جنت ہے ! "اَلَآ اِنَّ اَولیاءَ اللّٰہِ لَا خَوفٌ عَلَیہِم وَلَا ہُم یَحزَنُونَ" !

لہذا تم آج ہی سے

نفرت	کی بجائے	محبت
خوف	؍؍	جرأت

حزن	کی بجائے	فرح اور خوشی
شہوت	"	پاکیٔ نفس
فقر و افلاس	"	آسودگی و خوشحالی
ناکامیابی و شکست	"	کامیابی اور فتح
کمزوری	"	قوت
شک	"	یقین
خود غرضی	"	ایثارِ نفس
بیماری	"	صحت
شکایت	"	صبر و شکر

وغیرہ

کے خیالات اپنے ذہن میں جمانا شروع کر دو۔ ابتدا میں تمہیں دقت ہوگی۔ مایوس نہ ہو جانا۔ اور اپنی کوشش برابر جاری رکھنا۔ چند ہی روز کی مشق سے مشکل آسان ہو جائیگی اور تم صحیح معنی میں مجاہد بنتے جاوگے۔ مجاہدہ کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں کہ "فجور" کے علم کو "تقویٰ" کے علم سے بدل دیا جائے۔ علم ہی پر عمل سرزد ہوتا ہے، بالفاظ دیگر عمل نتیجہ ہے علم کا۔ علم کی تصحیح سے عمل کی تصحیح ہو جائیگی۔ علت کے تغیر سے معلول بھی متغیر ہو جائے گا۔ شر اور بدی کے خیالات کا دل میں آنا بشریت ہے اور بشریت اور اس کے اقتضاءات فنا نہیں ہو سکتے۔ ان خیالات کو "خواطر" کہتے ہیں۔ یہ ضرور قلب میں خطور کریں گے۔ انہیں روکا نہیں جا سکتا۔ روکنے کی ہر کوشش ان کی قوت کے ازدیاد کا باعث ہوگی۔ ہاں انہیں بدلا جا سکتا ہے ان کا نیک خیالات سے مبادلہ ہو سکتا ہے، ضرورت بھی اتنی ہی ہے۔ قلب کی تطہیر اسی طرح ہو سکتی ہے۔ برے خیالات پر توجہ کو مرکوز نہ کرو۔ توجہ ان کی جڑوں کو مضبوط کرتی ہے اور رفتہ رفتہ ان کا منحوس سایہ قلب پر چھا جاتا ہے۔ اب عمل تابع ہے علم کے، لہٰذا عمل کا برا ہونا بھی لازمی ہے! مجاہدہ بیوی بچوں کا چھوڑنا جنگل میں گوشہ نشینی اختیار کرنا، راتوں میں کم سونا، فاقہ کرنا نہیں، مجاہدہ قلب کا تصفیہ ہے، اعمال کا تزکیہ، روح کا تجلیہ، اور اس کا واحد طریقہ خیالات فاسدہ کا دماغ سے تخلیہ ہے! ہم اس مجاہد کے ہاتھ چومتے ہیں جو اپنے قلب و دماغ میں فاسد خیالات کے بجائے پاک خیالات کو، سلبی افکار کی بجائے ایجابی افکار کو جگہ دیتا ہے اور اس طرح اعمال سیئہ کا دروازہ بند کر دیتا ہے! ہم نے اوپر جو کچھ کہا ہے "قلیل" ہے لیکن قول "ثقیل" ہے اور توجہ کے قابل

عارف سخن ارچہ مختصر ساز کند چشمت بینائی عالم راز کند
ہش دار کہ ہر چند کہ خرد است کلید ہر خانہ بس بزرگ در باز کند

فارسی زبان کی اہمیت اور اس کی تعلیم کے متعلق چند مشورے

از

جناب قاری سید کلیم اللہ حسینی صاحب ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ بی (عثمانیہ) پی ایچ۔ ڈی (لندن) ریڈر کلیہ جامعہ عثمانیہ

زبان فارسی یا ایرانی دنیا کی شیریں ترین زبانوں میں شمار کی جاتی ہے۔ یورپ میں جیسے فرانسیسی اور اطالوی زبانوں کو نہایت شیریں کہا جاتا ہے ایشیا میں ایرانی زبان کی نسبت بھی یہی خیال ہے خود ایرانیوں نے دوسری زبانوں کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے اپنی زبان کے متعلق کہا ہے ”عربی لغت است ترکی ہنر است و فارسی شکر است و باقی گوز خر است“

ہم کو ایرانیوں کے اس قول کے آخری حصہ سے اتفاق نہیں، کیونکہ ہماری مادری زبان اردو بھی اس سے کم مہذب اور کم شیریں نہیں ہے، اگر وہ فارسی کی برابر کی بہن ہونے کا دعوے نہیں کر سکتی تو اس کی بھتیجی ہونے سے بھی کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔

اردو زبان سے اچھی طرح واقف ہونے کے لئے فارسی زبان کا جاننا ضروری ہے۔ اور فارسی دانی کے لئے عربی قابلیت کی ضرورت ہے جس کا حصول ہر مسلمان پر فرض ہے، گو اردو میں عربی الفاظ بھی شامل ہیں لیکن وہ ایسے ہیں جو فارسی میں مستعمل ہیں، مسلمانوں کو اس وجہ سے بھی فارسی زبان جاننا لازمی ہے کہ اس زبان میں بزرگان دین و علمائے متبحرین نے مختلف علوم و فنون مثلاً تصوف، فلسفہ، اخلاق، حکمت، اور تاریخ وغیرہ میں زبردست کتابیں تصنیف کی ہیں، تصوف فارسی شاعری کی جان ہے، صوفیانہ مضامین اس قدر

کثرت کے ساتھ غالباً کسی دوسری زبان میں نہیں مل سکتے۔ مثنوی مولانا روم، مخزن اسرار نظامی، گلشن راز شبستری، رباعیات ابوسعید ابوالخیر، قطعات ابن یمین، اور دیوان حافظ مثال کے طور پر پیش کئے جا سکتے ہیں! رزمیہ مثنوی شاہنامہ، ہومر کی الیڈ اور مہابھارت کا ہم پلہ تصور کی جاتی ہے۔ حافظ و سعدی جیسے شاعر دنیا کی کسی مہذب زبان کے بڑے بڑے شاعروں کے مدمقابل ہیں، تاریخ جہانکشائے جوینی، جامع التواریخ، تاریخ وصاف، تاریخ گزیدہ، راحت الصدور اور حبیب السیر وغیرہ بڑی زبانوں کی مستند تاریخوں کی ٹکر کی ہیں حقیقت یہ ہے کہ جس زبان میں حافظ و سعدی جیسے سخنور، خاقانی، انوری، ظہیر فاریابی اور قاآنی جیسے قصیدہ نگار، ابوسعید ابوالخیر و عمر خیام جیسے رباعی گو اور فردوسی، نظامی، اور مولانا روم جیسے یگانہ روزگار مشاہیر کے شاہکار موجود ہوں تو وہ زبان دنیا کی اہم ترین زبانوں کی صف میں کیونکر شمار نہ ہو۔

ایرانی زبان صرف ایران تک محدود نہیں ہے بلکہ دیگر ممالک یورپ و امریکہ میں بھی اس کے جاننے والوں اور قدردانوں کی کافی تعداد موجود ہے۔ اور وہاں ایسے مستشرقین گذرے اور موجود ہیں۔ جنہوں نے اس کی ادبیات پر اپنی عمریں اور جائدادیں صرف کر دی ہیں۔ فرانسیسی مستشرقین، شیفر، بلوشہ وغیرہ مشہور ہیں! روسی مستشرق وکٹر روزن اور بارٹالڈ کے کارناموں سے ادبی دنیا واقف ہے، جرمن مستشرقین واسٹنفیلڈ، نولڈیک، براکلمن، مارکواٹ، از فاؤ، پرتش اور اہلوارڈٹ وغیرہ کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہے۔ انھوں نے ادبیات عربی و فارسی کی اسقدر خدمت کی ہے اور ایسی تصانیف چھوڑی ہیں جو رہتی دنیا تک اپنا نور پھیلاتی رہنگی! انگلستان کے پروفیسر ول براؤن، نکلسن، الڈ ڈینسن راس اور دیگر فضلا ریو رلیس، اور اسٹوری کے کارناموں سے بہت کم ایرانی اور فارسی داں حضرات ناواقف ہونگے۔ پروفیسر براؤن کو ادبیات ایران کے متعلق اسقدر شغف تھا کہ انھوں نے اپنی زندگی اس کے لئے وقف کر دی تھی۔ اور اتنی تصانیف یادگار چھوڑی ہیں کہ کسی ایرانی علامہ نے بھی کم لکھی ہونگی۔ یہ ادبیات ایران کی اہمیت و جاذبیت کے اثرات ہیں۔

فارسی زبان نے اپنی شیرینی، ہردلعزیزی اور اہمیت کے باعث غیر ممالک کے علم دوست افراد کے دلوں میں بھی جگہ کر لی ہے۔ یورپ و امریکہ کے اکثر تعلیم یافتہ لوگ خیام کے کلام سے بڑی محبت رکھتے ہیں۔ اسکے ترجمے جو دنیا کی ہر مہذب زبان میں کئے گئے ہیں انکو اور خود رباعیات کو پڑھکر لطف اندوز ہوتے ہیں، انگلستان والوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ایک کلب بھی "عمر خیام کلب" کے نام سے قایم کیا۔ جہاں اس بین الاقوامی شہرت رکھنے والے شاعر کی برسی دھوم دھام سے منائی جاتی ہے۔ اور انگلستان سے پھولوں کا ہار اسکی مزار پر چڑھانے کے لئے ایران بھیجا جاتا ہے، اس کلب نے ناصر الدین شاہ قاچار سے درخواست بھی کی تھی کہ خیام کا مقبرہ اس کے نام کے شایان شان بنوایا جائے۔ اور اس کی دیکھ بھال خاطر خواہ کیجائے حقیقت یہ ہے کہ

عمر خیام کی ایران سے باہر جیسی قدر ہوئی خود اس کے وطن میں نہیں ہوئی۔ اس کے اسباب جدا ہیں جن کا اس وقت بیان کرنا طول عمل ہوگا۔

جب مسلمان بادشاہ افغانستان و ایران سے ہندوستان آئے تو ان کی زبان مادری فارسی تھی۔ اس زبان شیریں نے ہندوستانیوں کے دلوں کو موہ لیا اور ہندوستان اس کا دوسرا گھر بن گیا۔ مسلمان ہندو دونوں نے اس کو اپنا لیا۔ چونکہ ہر زمانہ میں حکومت کی زبان میں مہارت تامہ پیدا کرنا اور اس کو اظہار خیال کا ذریعہ بنانا فیشن اور قابل فخر خیال کیا جاتا ہے۔ اس لئے ہر شخص یہی زبان سیکھنے لگا۔ اور اس کا عام رواج ہوتا گیا۔ دفاتر سرکاری میں، معاشرتی جلسوں میں، خط و کتابت میں غرضکہ ہر جگہ فارسی ہی فارسی بولی اور لکھی جانے لگی۔ بعد میں جب اردو کا رواج ہوا تو اس کے متعلق بھی۔ جو کچھ لکھا جاتا تو فارسی ہی میں، چنانچہ اردو شعراء کے متعلق تذکرے فارسی میں لکھے گئے، مثلاً گلشن بے خار، مصطفےٰ خاں شیفتہ، نکات الشعراء میر تقی میر، چمنستان شعراء لچھمی نارائن شفیق وغیرہ اور اکثر تصانیف بھی فارسی میں کی گئیں مثلاً آثر آصفی، آثر رحیمی، وغیرہ۔ ہندوستانیوں نے اس کو مادری زبان پر ترجیح دی۔ وہ عہد مغلیہ میں عروج پر رہی، فارسی کے صد ہا شاعر انشا پرداز و مصنفین پیدا ہوئے۔ جن کے کارنامے تا دور شمس و قمر باقی رہیں گے۔ ان میں سے امیر خسرو دہلوی، فیضی، ابو الفضل، نعمت خاں عالی اور متاخرین میں غالب اور اقبال مشت نمونہ از خروارے ہیں۔ علامہ شبلی نے فارسی شاعری اور شعراء کا تذکرہ کتاب شعر العجم لکھکر ایران والوں اور ایرانی زبان پر بڑا احسان کیا۔ ان کی یہ تصنیف ایران میں بھی بڑی قدر کی نظر سے دیکھی گئی۔ اور اس کا وہاں عام شہرہ ہے چنانچہ میرے قیام طہران کے زمانہ میں طہران یونیورسٹی کے پروفیسر آقائے سعید نفیسی نے رودکی کے احوال کا، جو مولوی شبلی نے شعر العجم میں لکھے ہیں، مجھسے فارسی میں ترجمہ کرایا۔ اور اپنی تالیف احوال واشعار رودکی میں اس کو شامل کیا دوسرے ایرانی بھی شعر العجم کے مضامین سے مستفید ہوتے ہیں۔ پروفیسر براؤن نے شعر العجم کا ذکر اپنی مشہور تصنیف تاریخ ادبیات ایران میں بڑی وقعت کے ساتھ کیا۔ اور بعض جگہ اس سے استفادہ بھی کیا ہے۔

عہد مغلیہ میں یوں تو پائے تخت دہلی کے علاوہ سارے ہندوستان میں فارسی رائج تھی لیکن بعض صوبوں میں خاص طور پر اس کو مدارج علیا حاصل ہوئے۔ بیجاپور میں عادل شاہی بادشاہوں کے علم پروری و فیضان کے انوار ہر طرف ضو فگن تھے۔ اور ظہوری کا نام ہمیشہ ان کی یاد تازہ کرتا رہے گا۔

قطب شاہی بادشاہوں کی بھی درباری زبان فارسی تھی۔ اور سلطان قلی قطب شاہ کا فارسی دیوان اس کی فارسی دانی، بلند خیالی، اور علم دوستی کا نمونہ ہے۔ وہ فارسی نظم میں شاہی تخلص کرتا ہے۔

مغلیہ خاندان کی یادگار سلطنت آصفجاہی کی درباری و دفتری زبان بھی فارسی تھی۔ یہاں بھی بلا امتیاز مذہب و ملت، جس کا اس وقت کوئی سوال نہ تھا۔ یہی زبان خط و کتابت، مراسلت، سرکاری فرامین اور تصنیف و تالیف کا ذریعہ تھی، کایستھ خاندانوں میں عموماً اور دیگر ہندوؤں میں بھی ابتدائی تعلیم کے ساتھ فارسی کی تعلیم ضروری سمجھی جاتی تھی۔

حیدرآباد دکن صانہا اللہ والیہا عن الشرور والفتن میں، دارالعلوم علوم شرقیہ کی عرصہ تک ضیا پاشی کرتا رہا۔ اس کا تعلق پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ شرقی سے تھا۔ اور اس درسگاہ کے فارغ التحصیل بڑے بڑے علماء جیسے علامہ جمال الدین نوری مرحوم پروفیسر نظام کالج، علامہ عبدالقدیر صاحب صدیقی سابق صدر شعبہ دینیات جامعہ عثمانیہ اور مولوی اکبر علیصاحب مہتمم صحیفہ وغیرہ ہیں۔ اور بڑے عہدوں پر میں مولوی یوسف الدین مرحوم، حبیب الدین، صدیق یار جنگ، حاکم الدولہ و سعد جنگ مرحوم وغیرہ تھے۔ اور نواب ادیب یار جنگ اور نواب مصاحب جنگ وغیرہ ہیں۔ اور دوسرے افراد بھی اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے جن کی تعداد کثیر ہے۔ ان حضرات نے ملک و قوم کی بڑی خدمات انجام دیں۔ تقریباً تیس سال کا عرصہ ہوا کہ درسگاہ کا تعلق پنجاب یونیورسٹی سے منقطع ہوگیا۔ اور جامعہ عثمانیہ کے قیام کے بعد دارالعلوم برخاست کردیا گیا۔

تقریباً پچاس ساٹھ سال ہوتے ہیں کہ دفتری زبان فارسی کی جگہ اردو نے لے لی۔ اور فارسی کا اثر و نفوذ کم ہوتا گیا۔ اور وہ کسمپرسی کے عالم میں تھی۔ لیکن اس غرق ہونے والی کشتی کا ناخدا خدائے تعالیٰ نے پیدا کردیا۔ اور اعلیٰحضرت سلطان العلوم نواب میر عثمان علیخاں بہادر آصف سابع خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ نے فارسی زبان کو مکرر زندہ کردیا۔ اور اپنے اشعار گہربار اور کلام فارسی سے بھی مردہ جسموں میں تازہ روح پھونکدی۔ جس سے بے اختیار زبان پر یہ شعر آتا ہے۔

زندہ کردی چوں مسیحا علم و فن را در دکن
زندہ باد اے میر عثمان علیخاں زندہ باد

مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر یمین السلطنت کا اسم گرامی فارسی زبان کے محسنوں میں شمار کیا جائیگا موصوف کے اعلیٰ کلام فارسی سے سامعین اپنا دامن علم گوہر مضامین سے پر کرتے ہیں۔ ممدوح نے ہمیشہ شعراء کی جو قدر و منزلت، مشاعروں کے انعقاد و داد و دہش وغیرہ سے کی ہے اس کا ایک نمونہ دیوان حسن سجزی دہلوی ہے جس کو فاضل محترم مولوی مسعود علیصاحب محوی نے بڑی کاوش و جانفشانی سے مرتب کیا اور مہاراجہ بہادر کے الطاف و عنایات سے زیور طبع سے آراستہ ہوا۔

حیدرآباد کے فارسی گو شعراء میں گرامی استاد اعلیٰحضرت مرحوم حضرت شمسی، ضیا یار جنگ ضیاؔ، گوبند راؤ جذبؔ، راجیشور راؤ اصغرؔ وغیرہ ہیں۔ فارسی زبان کی اہمیت معلوم ہونے کے بعد یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ متعلمین فارسی کو کونسی فارسی سیکھنے کی ضرورت ہے، قدیم یا جدید؟ قدیم سے میری مراد وہ زبان نہیں جو قبل اسلام یا اس کے بعد بولی جاتی تھی بلکہ یہاں اس سے میرا منشاء وہ فارسی زبان ہے جو مسلمان بادشاہوں کے ساتھ ہندوستان آئی۔ اور یہاں رواج پاتی رہی۔ اس زمانہ کی فارسی اور عصر جدید کی ایرانی زبان میں بیّن فرق ہے۔ فارسی زبان کے انمول موتیوں سے اپنا دامن علم بھرنے کے لئے قدیم ادبیات کا جاننا لازمی ہے لیکن صرف قدیم فارسی کی کتابیں پڑھکر اُس زمانہ کی فارسی زبان سیکھ کر اگر آپ ایران جائیں تو نہ آپ وہاں کے باشندوں کی تحریر و تقریر سے کماحقہٗ مستفید ہوسکیں گے نہ وہ آپ کی علمیت سے بہرہ اندوز ہوں گے۔ کیونکہ آج کل ایرانیوں کی زبان، ان کے خیالات اور ان کے اداکرنے کے سانچے اور ڈھانچے بڑی حد تک بدل گئے ہیں یہ ایک ناگزیر انقلاب اور لابدی تبدیلی ہے، مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ ہر ملک ترقی کرتا جارہا ہے۔ ریل و رسایل کی سہولتوں کے باعث اقتصادیت معاشرت، سیاست اور ادبیات وغیرہ سب پر اثرات پڑرہے ہیں تو زبان اس کے اثر سے کس طرح بچ سکتی تھی۔ اس میں بھی تغیر ہوا۔ اور ہونا لازمی تھا۔ اور خصوصاً اس نصف صدی میں تو ایران کی کایا ہی پلٹ گئی۔ اور اعلیٰحضرت رضا شاہ پہلوی کے عہد زرین میں ہر جہتی ترقی عظیم الشان طور پر ہوئی، ایران میں زبان تو ترقی کرتی رہی۔ اور ہندوستان میں فارسی ویسی ہی رہی جیسی یہاں آئی تھی۔ اور اسی حالت میں اب تک باقی ہے کیونکہ ہندوستانیوں کو نہ اس غیر زبان کی تبدیلی کا کوئی حق تھا اور نہ اس کا سلیقہ، اس لئے ہمیں ضروری ہے کہ ابوالفضل، رسایل طغرا، مینا بازار، پنج رقعہ، اور سہ نثر ظہوری یا حافظ و سعدی، خاقانی و قاآنی کے باغ علم کے گلچین بننے کے علاوہ عصر جدید کی ایرانی زبان سے بھی واقفیت کی کوشش کریں۔ میں جس زمانہ میں ایران گیا تھا تو باوجود منشی فاضل وغیرہ کے درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھنے کے وہاں کی زبان سمجھنے اور سمجھانے میں مجھے ابتداء میں دقت محسوس ہوئی۔ جو رفتہ رفتہ دور ہوگئی۔ آجکل کے ایرانی اخباروں کی زبان روزمرہ کی بول چال محاورہ جدید کے مطابق ہے۔ جو قدیم فارسی سے مضامین، انداز بیان، تراکیب جدید اور غیر زبانوں کے الفاظ کے داخلہ کی وجہ سے بڑی حد تک مختلف ہے۔ چنانچہ طہران میں دانش سرائے عالی کے ایک پروفیسر صاحب نے مجھ سے تذکرہ کیا کہ شاہ امان اللہ خاں جس وقت ایران گئے تھے تو پروفیسر صاحب ان کے ہمراہ رہتے تھے۔ بعض دفعہ شاہ نے ایسے فارسی الفاظ استعمال کئے تھے جن کو اوسط درجہ کے پڑھے لکھے نہ سمجھ سکے حالانکہ وہ فارسی الفاظ تھے لیکن اب انکی جگہ جدید فارسی کے الفاظ مستعمل ہیں۔

فارسی قدیم یا جدید کو صرف کتابیں پڑھکر علم حاصل کرنا کافی نہیں ہے۔ بلکہ اس کو زندہ زبان کی حیثیت سے سیکھنے کی ضرورت ہے۔ حالانکہ ہندوستان میں فارسی عموماً بطور ایک مردہ زبان کے سیکھی اور سکھائی جاتی ہے۔ علم صرف کتابوں اور سینوں میں رکھنے کی چیز نہیں بلکہ اس سے کام لینا چاہئے۔ تحریر و تقریر کے ذریعہ اس کو پھیلانے کی ضرورت ہے اسے حرکت دینا چاہئے۔ حرکت کا ہی دوسرا نام زندگی ہے۔

فارسی زبان کو رواج و ترقی دینے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ جب فارسی کی تعلیم دیجائے تو معلم مطالب کو فارسی میں سمجھائے۔ اور متعلم فارسی میں معلم سے سوال و جواب کرے اس سے فارسی کی استعداد بڑھتی اور گفتگو کی عادت ہوتی ہے۔ میں کالج کی جماعتوں میں مطالب عموماً فارسی ہی میں سمجھاتا ہوں تاکہ طلباء کو اسکے سننے اور بولنے کی عادت ہو۔

فارسی زبان کو ترقی دینے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ایک انجمن یا کلب قایم کیا جائے۔ اور وہاں فارسی میں تقریریں کی جائیں۔ مقالے پڑھے جائیں۔ گفتگو کی جائے۔ انگریزی فرانسیسی اور جرمنی وغیرہ زبانوں کی انجمنیں حیدرآباد میں قایم ہیں جہاں کم از کم ہفتہ میں لوگ ملتے آپس میں اسی زبان میں گفتگو اور تقریریں کرتے ہیں۔

حیدرآباد میں عربی کی بھی ایک انجمن انہیں اغراض کے تحت قایم ہوئی تھی جس کا نام نادی العربی تھا جس میں بڑے عہدہ دار، جاگیردار اور علم دوست حضرات شریک تھے۔ اس کے جلسے شروع میں تو بڑی دھوم دھام سے ہوئے اس کے بعد ختم ہو گئے۔ کوئی انجمن قایم کی جائے تو اوسکو جاری رکھنے کی بھی ضرورت ہے ہمیشہ کام متوسطین ہی عمدگی کے ساتھ چلا سکتے ہیں۔ بڑے لوگ جذبات کے تحت کام شروع کرتے ہیں۔ ابتدا میں خوب گرمی رہتی ہے۔ رفتہ رفتہ انکی مصروفیات اور عدم دلچسپی کے باعث جذبات سرد پڑ جاتے ہیں۔ اور کام ختم ہو جاتا ہے لیکن ذوق علم کی وجہ سے بلا نمود و نمائش علمی کام شروع کیا جائے تو دیرپا ہوتا ہے۔

اگر فارسی کی کوئی انجمن قایم کیجائے تو اس میں ایرانیوں کو بھی، جو حیدرآباد میں ہیں ضرور مدعو کیا جائے۔ ان سے تقاریر کرائی جائیں۔ تبادلہ خیالات کیا جائے۔ فارسی بولی جائے تو گفتگو و تحریر کی عادت ہو گی۔ لب و لہجہ درست ہو گا کیونکہ لب و لہجہ کا سوال بھی بڑی حد تک اہم ہے لیکن کسی غیر زبان کی کامل نقالی محال نہیں تو مشکل ضرور ہے، خصوصاً جبکہ اہل زبان حضرات سے ملنے جلنے کا کم اتفاق ہوتا ہو، اہل زبان سے گفتگو کے وقت لب و لہجہ کو بہت دخل ہے مسٹر لائیڈ جیمس پروفیسر لسانیات لندن یونیورسٹی ہم سے لندن میں کہا کرتے تھے، اگر کسی انگریز کے ساتھ انگریزی لب و لہجہ میں گفتگو کیجائے تو وہ فوراً مفہوم سمجھ لے گا۔ خواہ

انگریزی غلط ہی کیوں نہو۔ اور اگر صحیح انگریزی میں گفتگو کی جائے۔ اور لب ولہجہ صحیح نہو تو وہ مفہوم سمجھنے میں مشکل محسوس کریگا۔ بلکہ قاصر رہے گا۔ اس لئے لب ولہجہ کی درستی کی بھی کوشش کیجانی چاہئے۔

یہ امر باعث مسرت و اطمینان ہے کہ حیدرآباد میں علوم مشرقیہ کی تعلیم کئی ادارے قایم کئے گئے ہیں۔ اور ان میں طلباء حصول علم کی خاطر اور کسب معاش کے لئے تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور امتحانات میں کامیاب ہو رہے ہیں۔ سنا گیا کہ ہر سال صدہا کی تعداد میں پنجاب یونیورسٹی کے امتحانات علوم مشرقیہ میں شریک ہو رہے ہیں۔ اس سے بہر طور فارسی کی طرف مسلمان نوجوانان حیدرآباد کا رجحان بڑھتا معلوم ہوتا ہے۔ باوجود مواقع و دشواریوں کے طلباء اتنی دور و دراز مقامات کا سفر اختیار کرکے مصارف برداشت کرکے کامیابی حاصل کر رہے ہیں۔ کیا اچھا ہوتا کہ جامعہ عثمانیہ میں ایک شعبہ خالص السنۂ مشرقیہ کا قائم کیا جاتا جیسا کہ پنجاب یونیورسٹی میں ہے۔ اس میں صرف وہی لوگ شریک ہوتے جو انگریزی سے نابلد اور علوم مشرقیہ کی تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ گو اس زمانہ میں انگریزی بھی جاننا ضروری ہے لیکن اسکے بغیر بھی اور زبانوں سے اہم کام انجام پاسکتے ہیں۔ ایسی صورت میں سہولتوں کے باعث امیدواروں کی تعداد ممکن ہے ہزارہا تک ترقی کر جائے۔ اور ملک میں تعلیم عام ہو جائے جس پر آجکل ہر جگہ بہت زور دیا جا رہا ہے۔ ایسے متعلمین جن کو امتحان کامیاب کرکے روزی کمانے کی فکر ہوتی ہے، جو زندگی کا اہم مسئلہ ہے۔ انکی خدمت میں یہ عرض ہے کہ جب وہ فارسی کسب معاش کی خاطر ہی سیکھتے ہوں تو پھر بھی اس کے حصول اور کامیابی امتحان کے بعد اس کو مطلقاً نہیں چھوڑ دینا چاہئے جس چیز کا مزہ ایک دفعہ چکھا ہے۔ اس کی لذت کو فراموش نہیں کرنا چاہئے بلکہ وہ اس دلچسپ سلسلہ کو جاری رکھیں اور دور جدید کی فارسی کتابوں، رسالوں، اور اخباروں کا جب موقع ملے۔ مطالعہ کرتے رہیں اور اپنے علم و معلومات میں اضافہ کریں۔

ہندوستانی یونیورسٹیوں کے امتحانات کے نصاب فارسی میں اب تک اکثر و بیشتر قدیم فارسی کی کتابیں رائج ہیں۔ جو موجودہ ایرانی زبان سے واقفیت کے لئے چنداں مفید نہیں اس لئے ضرورت اس کی ہے کہ قدیم فارسی کی کتابوں کے ساتھ دور جدید کی اعلٰی معیاری کتابوں کا معتدبہ حصہ نصاب میں شامل کیا جائے تاکہ موجودہ زمانہ کی ضروریات اس سے پوری ہوں ہم نے جامعہ عثمانیہ کے نصاب فارسی میں اس چیز کا خاص لحاظ رکھا ہے۔ فقط

"؟"

گریباں چاک محفل سے نکل جاؤں تو کیا ہوگا
تیری آنکھوں سے آنسو بن کے ڈھل جاؤں تو کیا ہوگا
جنوں کی لغزشیں خود پردہ دارِ رازِ الفت ہیں
جو کہتے ہو سنبھل جاؤ سنبھل جاؤں تو کیا ہوگا۔

مخدوم محی الدین ایم اے (عثمانیہ)

برطرح حضرت بندگانعالی مدظلہ العالی سلطان العلوم بتقریب سالگرہ ہمایونی

کیف مئے کو تو ذرا آبِ بقا سے پوچھو

غزل

لطف سی مھر سی انداز و ادا سے پوچھو
دمبدم دیکھے غریبوں کو ولا سے پوچھو

حالِ عشاق نہ تم جور و جفا سے پوچھو
پوچھنا ہی ہے اگر ناز و ادا سے پوچھو

آبِ حیواں پہ مرے جاتے ہیں مرنے والے
عمرِ جاوید خضر آبِ بقا سے پوچھو

بیخودی کا ہو مرا راز عیاں ہو ہی گیا۔
مئے پرستی کا مزہ لغزشِ پا سے پوچھو

شمع جلتی ہوئی کہتی ہے یہ پروانے سے
سوزشِ عشق کو اربابِ وفا سے پوچھو

شہ سلامت رہیں آباد رہیں شاد رہیں
مژدہ عیش یہ لائی ہے صبا سے پوچھو
آمین

جسکے ہر نقشِ قدم پر ہوں ہزاروں سجدے
اسکی توقیر کو نقشِ کفِ پا سے پوچھو

رہ نوردی سے برا حال ہے دیوانوں کا
خلشِ خارِ الم آبلہ پا سے پوچھو

صد وسی سال سلامت رہیں شاہ عثمان
یہ تمنا ہے دلی آلِ عبا سے پوچھو
آمین

اور اصحاب بھی موجود تھے لیکن صابر
فتح خیبر کو ذرا شیرِ خدا سے پوچھو

ندی کا کنارہ

از

جناب سید حسن الدین صاحب

(۱)

اگر تم پچھلے سمے کی کچھ باتیں سننا چاہتے ہو تو آؤ میرے گھاٹ کی اِن سیڑھیوں پر بیٹھ جاؤ۔ چاندنی رات میں چکور کا چنچل ناچ - پھولوں کی شوبھا، اور پانی کے چھل بل شور میں ایک دکھی کنیا کی پریم کہانی سنو۔

"ساون کا مہینہ تھا۔ ندی چڑھاؤ پر تھی صرف چار سیڑھیاں پانی میں ڈوبنے سے باقی رہ گئی تھیں موجیں کنارے سے دیوانہ وار ٹکراتیں اور لوٹ جاتیں۔ قریب کے تین ٹیلے پانی سے گھر کر ٹاپو بن گئے تھے۔ ماہی گیروں کی کشتیاں کنارے پر صبح شفق کے وقت موجوں میں رقص کرتیں۔ کنارے کی لانبی گھانس سوریا دیو کے درشن کے لئے بیتاب تھی۔ یکایک سورج کے دیوتا نے برقی کوڑا لگایا۔ اور اس کی رتھ افق پر نمودار ہوئی۔ پرند چہچہانے پھول ہنسنے لگے۔ وہ کل جو رات تمام سونی پڑی تھی پھر سے چلنے لگی۔ ملاحوں نے بادبان چھوڑ دئیے۔ برہمن اور پجاری گنگا جی میں اشنان کے لئے گھاٹ پر آئے۔ عورتوں نے بھی ۲ دو ۲ دو تین تین کی ٹولیوں میں گھاگر لئے پانی بھرنے آرہی تھیں۔

میں جانتی ہوں کہ یہ وقت کسُم کے گھاٹ پر آنے کا ہے لیکن اس صبح وہ نظر نہ آئی۔ کملا اور بسنتی اسکی یاد میں آنسو بہائے اور آپس میں یہ کہتی ہوئی چلی گئیں کہ اُنکی سکھی اپنے پتی کے گھر گئی ہے جہاں وہ دوسروں کے لئے اور دوسرے اس کے لئے اجنبی ہیں۔"

(۲)

ایک سال گذر گیا۔ عورتوں نے گھاٹ پر کسم کا ذکر کرنا بھی چھوڑ دیا۔ اور وہ میرے دماغ سے بھی بھولی بسری ہوگئی۔

لیکن ایک شام میں ان ہی قدموں کی چاپ سے حیرت میں پڑ گئی۔ اور کیا دیکھتی ہوں کہ اب نہ تو اُن میں جھانجھ ہیں اور نہ اُن کی جھنکار۔ کسم اب ودھوا (بیوہ) ہوگئی ہے۔ لوگ کہتے تھے کہ اُس کا سوامی دور دراز ملک میں کوئی کام یا دھندا کر رہا ہے۔ اب تک وہ اُس سے صرف ایک بار [illegible] ملی تھی۔ ناگاہ ایک خط نے اُس کی موت کی خبر سنائی۔

غریب لڑکی کا آٹھ سال کے سن میں بیوہ ہونا غضب تھا۔ اس نے اپنے سر سے [illegible] نکال دیا۔ چوڑیاں پھوڑ ڈالیں۔ اور پھر گنگا جی کے کنارے اپنے پرانے گھر میں واپس چلی آئی [illegible] اُس نے بہت کم اپنے ساتھیوں کو موجود پایا۔ کملا، بسنتی اور کاشی کا بیاہ ہو چکا تھا۔ اور وہ اپنے سسرال چلی گئیں۔ صرف ایک بیچاری نرملا ہی رہی، سنتے ہیں کہ اب کے پھاگن میں اُس کی [illegible] ہے۔

جس طرح گنگا بارش میں پانی سے بھر جاتی ہے اُسی طرح کسم کی جوانی اور خوبصورتی میں روز [illegible] اضافہ ہوتا گیا۔ لیکن سفید لباس، غمگین چہرہ اور خاموش طبیعت نے اُس کی جوانی پر پردہ ڈال رکھا تھا۔ دس سال گذر گئے اور کسی نے بھی آن کر اس کی خبر نہ لی۔ وہ جوان ہوگئی تھی لیکن اب کسی کو اس کی جوانی کی کیا پرواہ!

(۳)

بیساکھ کے آخری دنوں میں ایک سنیاسی گورے رنگ اور لانبے قد کا نہ معلوم کہاں سے [illegible] آدھمکا اور شیوا کے مندر ہی میں آ کر آسن جمایا۔ دُور دُور اُس کے چرچے ہوئے۔ کنیائیں اپنے [illegible] اُس کے درشن کو نکل آئیں۔ دن بدن ہجوم بڑھتا گیا۔ عورتوں میں تو اُس کی شہرت کی دھوم مچی تھی۔ کبھی وہ بھگوت گیتا کے گیت گاتا۔ اور لوگوں کو اس کا مطلب سمجھاتا۔

بھادوں کے مہینے میں سورج گہن لگنے والا تھا۔ گنگا کے کنارے اشنان کرنے والوں کا ہجوم تھا۔ بہت سے جاتری سنیاسی کے درشن کو آئے۔ عورتوں کے مجمع میں کسم کے گاؤں کی رہنے والی ایک [illegible]

بھی تھی صبح کا وقت تھا سنیاسی کنارے پر بیٹھے بالا جپ رہا تھا۔ کہ یکایک ان استریوں میں سے ایک نے
کانا پھوسی کی۔ "کیوں بہن کملا! یہہ تو ہماری کسم کا سوامی معلوم ہوتا ہے! دوسری نے اپنی ساری کا آنچل
اٹھایا اور کہا" ہاں بہن میرا بھی یہی خیال ہے"۔
تیسری نے پردہ کی آڑ سے کہا۔
"اُس کا ناک نقشہ تو ہو بہو وہی ہے"۔
ایک اور عورت نے سنیاسی کو دیکھے بغیر اپنی گگری سر پر اٹھاتے ہوئے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر
کہا" نہ معلوم وہ نوجوان کس رنگ میں ہو کسم بیچاری کی تو قسمت ہی پھوٹ گئی۔

(۴)

اُس وقت تو قصہ ختم ہو گیا اور بات بڑھنے نہ پائی۔ ایک رات چاند نکل آیا کسم آن کر ندی کے
کنارے بیٹھ گئی۔ اور اپنے پرچھائیں کو ندی کے پانی میں گھورنے لگی۔ اُس وقت گھاٹ کے قریب کوئی
نہ تھا۔ جھینگروں کی آواز سے کان پھٹے جا رہے تھے۔ گاؤں کے گھنٹے اور مندر کی گھنٹیاں بج رہی تھیں
یہاں تک کہ آواز کی آخری موج بھی آہستہ آہستہ سایہ کی طرح کنارے کی دوسری طرف تاریک
جھنڈوں میں سما گئی۔
گنگا کے پانی پر چاند کی روشنی جھلملا رہی تھی۔ کنارے پر جھاڑیوں اور درختوں کے جھنڈ مندر کے
در و دیوار، ٹوٹے کھنڈروں، تالاب کے کناروں اور کھجور کے درختوں سے عجیب قسم کے سائے بنتے اور بگڑتے
تھے۔ جنگلی بڑ بڑھ کے درختوں سے لٹک رہی اور جھونپڑیوں کے قریب لومڑیاں کبھی اونچی آوازیں بول رہی
تھیں۔ اُن کی آواز فضا میں گونجتی اور خاموش ہو جاتی تھی۔
سنیاسی آہستہ مندر کے باہر نکل آیا۔ گھاٹ کی چند سیڑھیاں اُترنے کے بعد اُس نے دیکھا کہ ایک
عورت تنہا وہاں بیٹھی اور کوئی دم میں وہاں سے جانا ہی چاہتی ہے۔ کسم نے اپنا سر اٹھایا اور آہٹ پاکر
اوپر کی طرف دیکھا۔ ساری کا آنچل ڈھلک چکا تھا اور چاند کی روشنی اُس کے چہرہ پر پوری طرح پڑ رہی تھی۔
کہ یکایک اُلو ان کے سروں پر بولا اور اُڑ گیا۔ اس آواز سے چونک کر کسم اپنے آپ میں آئی آنچل درست
کیا اور گردن کو پرنام کیا۔ سنیاسی نے آشیرواد دی اور پوچھا" استری تم کون ہو؟ رات کے اس سمے یہاں
آنے کا کارن دسبب (؟) اس لئے کہا" کچھ بھی نہیں" اور ایک لفظ بھی زبان سے نکالے بغیر کسم نے آہستہ سے
اپنے گھر کی راہ لی۔ جو نہایت ہی ناہموار اور پتھریلا تھا۔ لیکن اس رات سنیاسی رات گئے بہت دیر تک

میری سیڑھیوں پر بیٹھا رہا۔ یہاں تک کہ چاند مشرق سے نکل کر مغرب کی طرف غروب ہو رہا تھا۔ سنیاسی کا سایہ پیچھے سے ہٹ کر سامنے کی طرف پڑنے لگا۔ وہ اٹھا اور اس نے مندر کی راہ لی۔

(۵)

میں نے کسم کو اس روز سے برابر سنیاسی کے درشن کرتے دیکھا ہے جب وہ بھگوت گیتا پڑھ کر سناتا تو وہ ایک گوشہ میں کھڑے ہو کر بڑے غور سے سنتی۔ صبح کی پوجا ختم ہوتے ہی اس کو بلا کر دیا اور دھرم کی باتیں بتاتا۔

وہ ان کو نہیں سمجھ سکتی تھی لیکن خاموشی اور توجہ سے سن کر سمجھنے کی کوشش ضرور کرتی جیسی وہ اس کو شکشا (ہدایت) دیتا۔ اسی پر عمل کرتی۔ مندر کو آنا جانا اب اس کا روز کا معمول تھا۔ دیوتاؤں کی پوجا پاٹ میں کوئی کمی نہ کرتی۔ پوجا کے لئے پھول جمع کرتی اور ماتا گنگا کے جل (پانی) سے مندر کا فرش دھوتی۔

جاڑا ختم ہو رہا تھا۔ ہوا میں ٹھنڈک تھی۔ کبھی کبھی شام کے وقت موسم بہار کے خوشگوار جھونکے چلتے تھے رت بدلتے ہی کہیں سے ہنسی کی اور کہیں سے گانے کی آواز آتی۔ ملاح اپنی کشتیوں کو بہاؤ کے رخ چھوڑ دیتے جو چلا تا چھوڑ کر کرشن کے گیت گاتے۔ اس خوشگوار موسم میں کسم کہیں بھی نظر نہ آئی۔ کچھ عرصہ سے اس نے گھاٹ مندر اور سنیاسی کے درشن کو بھی آنا جانا چھوڑ دیا۔ اس کے غائب رہنے کی وجہ معلوم نہ ہوئی۔ لیکن ایک شام ان دونوں کی ملاقات میرے ہی سیڑھیوں پر ہوئی۔

نیچی نظر کئے ہوئے کسم نے دریافت کیا۔

”کیا آپ نے مجھکو یاد کیا مالک؟“

”ہاں میں نے تم کو یاد کیا ہے! بتاؤ میں تم سے کیسے غفلت برت سکتا ہوں؟“

”آخر تم نے دیوتاؤں کی پوجا پاٹ کیوں چھوڑ رکھی ہے؟ ان مورتیوں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟“

”نہیں! کچھ بھی نہیں!“ کسم نے دبی آواز سے کہا۔

”کسم سمجھ کہ ان ہاتھوں سے بنائی ہوئی پتھر کی مورتیوں میں کیا رکھا ہے۔

دھرم اور دیوتا صرف نرے شبد (الفاظ) ہی نہیں جو سارے سنسار میں فتنہ اور فساد کا باعث ہیں۔ منش چاہتا ہے کہ دنیا کے سارے جلوے اور نیرنگیاں سمٹ کر صرف ایک نقطہ پر آجائیں اور وہ نقطہ اس کا دل ہو۔

اس دل کی دنیا پر قابو دھرم ہی رکھ سکتا ہے۔ صداقت۔ دیا۔ اور دھرم کے ہتھیاروں سے لیس ہو کر جب یہ تھا سپاہی فطرت کی تسخیر کے لئے نکلتا ہے تو انسانیت کا دشمن شترو (شیطان) قدم قدم پر اس کی راہ میں روڑے اٹکاتا ہے۔ اور یہ حق کا دیپک ہاتھ میں لئے پاپ کے اندھیرے میں جیون کا راستہ ڈھونڈھتا ہے۔ اس کی آتما حق کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ خواہ اس کا جلوہ اس کو پتھر کی مورتی میں نظر آئے یا سورج کی کرنوں میں یا فطرت میں۔ کسم یہ نہ سمجھ کہ یہ سنسار مورکھوں کی بنائی ہوئی سرزمین ہے جہاں چند سرپھرے برہمنوں اور سنیاسیوں نے اپنے آدر (عزت) اور کامنا (بھلائی) کے لئے مذہب کا ایک بت تراشا ہے اور سارے سنسار میں ایک ڈھونگ مچا رکھا ہے۔ دھرم کے پردے میں منش مہا سے مہا پاپ بھی کرے تو جائز ہے۔ یہ دھرم نہیں ادھرم ہے۔

زندگی دوڑ دھوپ کشمکش اور ایک مسلسل کوشش کا نام ہے جہاں سکھ ملتا ہے۔ پرنتو دکھ، دکھ کے بعد شانتی ملتی ہے۔ کیول بڑے بڑے سنکٹوں کے بعد۔ جو دکھ میں خوش رہے پریمی داسے محبت کرنے والے) میں تجھکو نہیں بتا سکتا!

"منش کو چاہئے کہ صبر اور انتظار کرے!"

"نہیں! نہیں! گرو جی یہ بات نہیں!

میرے من مندر میں جو مورتی بیٹھی ہے کیول (صرف) اس نے پریشان کر رکھا ہے۔ میں شانتی چاہتی ہوں۔ مگر میری آتما کو شانتی نصیب نہیں ہوتی۔ وہ ایک زخمی پرندہ کی طرح میرے ہی گرد چکر کاٹ رہی ہے میں ابھاگن ہوں مجھ پر دیا کرو۔"

کہو وہ کیا چیز ہے۔ جو تمہاری آتما کو بے چین کر رہی ہے۔ سارا حال سچ سچ بیان کر دو۔"

کسی قدر چہرہ کو اوپر اٹھائے ہوئے کسم نے جواب دیا۔"

"میں پاپی ہوں اس لئے پوجا کو نہ آسکی۔"

سنیاسی نے کہا "کسم تمہاری روح میں، میں ایک قسم کی بے چینی محسوس کرتا ہوں۔ کیا یہ سچ ہے؟"

کسم نے ساری کا آنچل درست کیا۔ گھاٹ کی جس سیڑھی پر سنیاسی کھڑا تھا وہاں بیٹھ گئی۔ اور اپنا سر اس کے چرنوں پر رکھکر بے اختیار سسکیاں بھرنے لگی۔ سنیاسی پر اس کا بہت اثر ہوا۔ اور اس نے پیچھے کی طرف ہٹ کر کہا۔ "کہو! تمہارے دل میں جو کچھ ہے صاف صاف بیان کر دو تاکہ میں تمہیں شانتی کا راستہ بتلاؤں۔"

کسم رکتے رکتے اور اظہار مطلب کے لئے الفاظ ڈھونڈتے ہوئے اس ہی لہجہ میں کہا جس سے اس کا مستقل ارادہ ظاہر ہو رہا تھا۔ "اگر تم اصرار ہی کرتے ہو تو لو میں صاف صاف کہے دیتی ہوں ـــ لیکن میں صاف طور پر

سمجھا نہ سکونگی۔ اگر میں کہیں رک جاؤں تو غالباً آپ میرا مطلب سمجھ جاؤ گے ناما لک!"

"ہاں کہے جاؤ"

میں بھی کسی کی سورتی کو دیوتا کی طرح صبح شام پوجتی اور اس پوجن سے میرے ہردے (دل) کو چین اور آتما کو شانتی نصیب ہوتی۔ لیکن ایک رات میں نے سپنے (خواب) میں دیکھا کہ میرے من مندر کا دیوتا باغ میں بیٹھا ہوا ہے میرا داہنا ہاتھ اس کے بائیں ہاتھ میں ہے اور مجھ سے پریم کی باتیں کر رہا ہے۔ یہ تمام باتیں مجھ کو نئی نہیں لگ رہی تھیں صبح اٹھ کر میں کیا دیکھتی ہوں کہ خواب تو خیال تھا مگر اس کا اثر میری آتما کو اپنی طلسمی گرفت میں لئے ہوئے دوسرے دن جب میں نے اس کو پھر دیکھا تو وہ مجھ کو کچھ اور ہی رنگ میں دکھائی دیا۔ غرض ان خیالی تیلوں نے میرا پیچھا نہ چھوڑا۔ اور میں خوف کے مارے ان سے بہت دور بھاگنے لگی۔ اس وقت سے میرا دل بے چین اور میری روح بیقرار ہے۔"

(۶)

جب وہ اپنی دکھ کی کہانی سناتے ہوئے آنسو صاف کر رہی تھی تو میں نے محسوس کیا کہ سنیاسی اپنے داہنے پیر سے میرے گھاٹ کے پتھر کو دبا رہا ہے۔"

اس کی گفتگو ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ سنیاسی نے کہا "سچ کہو تم نے خواب میں کس کو دیکھا" کسم نے ہاتھ جوڑ کر التجا کی اور "نہیں! نہیں! میں نہیں بتا سکتی۔!"

اس نے مجبور کرتے ہوئے کہا "تم کو کہنا ہی ہوگا" کہو کسم وہ پاپی کون تھا؟" کسم نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا کیا مجھ کو سچ کہنا ہی ہوگا"

اس نے جواب دیا" ہاں! سچ سچ بتاؤ وہ کون تھا؟"

"بچاؤ! میرے من میں آگ لگی ہے! سوامی آنکر بچاؤ! وہ دیکھو میرے سامنے آگ ہے ۔ میرے چاروں طرف آگ ہے ۔ پانی میں آگ ۔ پہاڑوں میں آگ ۔ پھولوں میں آگ ۔ سارے زمین و آسمان میں آگ لگی ہے اور میں اپنے من کی آگ میں آپ جلی جا رہی ہوں ۔ آہ شانتی! شانتی ۔" یہ کہکر کسم سنیاسی کے آغوش میں گر پڑی۔ پریم کا دیا من مندر میں جل رہا تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور وہ یہ کہتے ہوئے ہوش میں آئی۔ "تم وہی ہو مالک!" تم وہی ہو جس کو میں نے سپنے میں دیکھا ہے" کسم اٹھ بیٹھی۔ سنیاسی نے آہستہ سے کہا "میں یہ مقام آج رات ہی چھوڑ رہا ہوں اسلئے کہ تم مجھکو ہمیشہ کے لئے اب نہ دیکھ سکوگی۔ جانتی ہو کہ میں سنیاسی ہوں! میری دنیا ہی نرالی ہے!۔ بھول جاؤ! تم مجھکو ہمیشہ کے لئے بھول جاؤ! اور میرے خیال کو ہمیشہ کے لئے دل سے نکال دو۔"

کسم نے آہستہ سے جواب دیا" ہاں! ایسا ہی ہوگا مالک!" سنیاسی یہ کہکر بغیر ایک لفظ زبان سے نکالے چلا گیا۔

سنیاسی جاگنے سے پہلے کسم اُس کے چرن چومی اور اس کے چرنوں کی خاک اپنے سر میں لگائی۔
چاند غروب ہو رہا تھا۔ رات اندھیری ہوتی جاتی تھی۔ میں نے پانی میں کسی بھاری چیز کے گرنے کی آواز سُنی۔ تیز ہوائیں چل رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ آکاش کے تاروں کو پھونک کر بجھانا چاہتی ہیں ــــ

ست گرو دت داتا۔

(آزاد ترجمہ) (ٹیگور)

از
جناب صاحبزادہ میکش

اُچھل کر موجِ دریا آسماں پر جا نہیں سکتی || کلی افسردہ ہو کر باغ کو مہکا نہیں سکتی
شعاعِ ماہ دن کو چاندنی برسا نہیں سکتی || چھپا دیتی ہے بدلی مہر کو گہنا نہیں سکتی

اندھیرے میں کسی کا ساتھ سایہ دے نہیں سکتا
اجل کی گود میں انساں کروٹ لے نہیں سکتا

مہِ نو ایک دن میں بدرِ کامل بن نہیں سکتا || چراغِ راہ بجھ کر شمعِ منزل بن نہیں سکتا
سفینے کے لئے گرداب ساحل بن نہیں سکتا || تڑپ پتھر میں آنے پر بھی وہ دل بن نہیں سکتا

طلوعِ صبح سے پہلے ہمیشہ رات رہتی ہے
بدل کر بھی وہی دنیا کی ہر اک بات رہتی ہے

گھٹا میں مہر چھپ کر اپنا جلوہ کھو نہیں سکتا
غبارِ رہ گزر دامن کے دھبّے دھو نہیں سکتا
بہے بھی قطرۂ شبنم تو دریا ہو نہیں سکتا
نہ آئیں آنکھ میں آنسو تو کوئی رو نہیں سکتا

خدائی پا کے بھی بندے خدائی کر نہیں سکتے
اجل کو مانگنے سے جینے والے مر نہیں سکتے

فلک سے ٹوٹ کر تارا زمیں پر رہ نہیں سکتا
کنول ہنستا ہے لیکن زورِ طوفاں سہہ نہیں سکتا
بہانے سے کسی کے خشک دریا بہہ نہیں سکتا
اشاروں سے بتا دیتا ہے گونگا کہہ نہیں سکتا

کبھی ہلکی ہواؤں سے صنوبر جھک نہیں سکتے
خس و خاشاک سے دریا کے دھارے رک نہیں سکتے

نمودِ رنگ ہیں پرچھائیاں بزمِ تماشا کی
دلوں کی دھڑکنوں میں جذب ہیں لہریں تمنا کی
نظامِ دہر کی پابند ہے ہر چیز دنیا کی
فریبِ زندگانی ہے یہ پابندی، یہ بے باکی

حقیقت کیلئے پھیلے ہوئے باطل کے پھندے ہیں
خدا کو علم ہے ہم کس قدر مجبور بندے ہیں

بجی بہروں کی محفل میں ہزاروں بار شہنائی
سنائی عزت و ناموس لے رودادِ رسوائی
شکستہ دل لئے پھرتے رہے بہروں تمنائی
مگر مایوسیوں میں گم رہا ارمان شنوائی

یہ دنیا ہے یہاں بے سود ہر فریاد ہوتی ہے
کرم کی آڑ میں اکثر یہاں بیداد ہوتی ہے

متاعِ زندگی تو مانگ لی جینا نہیں آتا
لگا لیتے ہیں ساغر ہونٹ سے پینا نہیں آتا
گریباں چاک رہتا ہے مگر سینا نہیں آتا
دلوں پر چوٹ لگتی ہے مگر کینا نہیں آتا

یہ بیداری ہے دل تو جاگتا ہے آنکھ سوتی ہے
کہ آزادی غلاموں کی بڑی پابند ہوتی ہے

گلِ مقصود کو فولاد کے سانچے میں ڈھلنا ہے
حقیقت کا سہارا لے کے دنیا میں سنبھلنا ہے
خرام بحر بن کر سنگِ خارا سے ابلنا ہے
سکون وا کردہ آغوش بھی ہو تو مچلنا ہے

یہ دنیا ہے یہاں ناکامیاں ہی کام دیتی ہیں
پریشانی کو دل کی دھڑکنیں انعام دیتی ہیں

اقوال

(حکیم پستالوزی)

۱۔ زبانی وعظ و نصیحت سے حقیقی زندگی اور صحیح راستہ کی رہبری کسی طرح نہیں ہو سکتی اور زندگی کا مقصد اعظم اور صداقت مذہب روزمرہ کی لگاتار کشمکش اور جوشِ عمل سے حاصل ہو سکتا۔

۲۔ بچوں میں ابتدا ہی سے اُس ضبط اور مستقل مزاجی کی بنیاد ڈالنی چاہئے جس سے وہ آیندہ مصیبت اور سختی سہنے کے عادی بن جائیں۔

۳۔ بچوں میں خدا کی محبت اور انسانی ہمدردی وعظ و نصیحت سے نہیں بلکہ اُن کو محنت کرنے کا عادی بنا کر پیدا کیجائے۔

۴۔ تعلیم میں نرمی اور محبت اُسی صورت میں مفید ثابت ہو سکتی ہیں جب کہ اُس میں کچھ خوف کی چاشنی بھی شامل ہو۔ بچوں کو زندگی کے کٹھن اور پر خار راستوں سے گذرنا سیکھنا چاہئے۔ اور بچے خصوصاً ان چیزوں کی طرف فطرتاً مائل نہیں ہوتے جب تک کہ شدت نہ کی جائے یا عادت نہ ہو جائے۔

۵۔ بچوں کی تربیت میں دل اور دماغ دونوں کا خیال کرنا چاہئے یعنی جو باتیں بچوں کے دل و دماغ میں داخل ہوں وہ اس قدر صاف اور واضح ہوں جیسا کہ چاندنی رات میں چاند اور اُن کو بتلایا جائے کہ وہ اپنے پورے حواسِ خمسہ سے کام لیا کریں۔

فیاض الدین

تعلیم میں کھیل کی اہمیت

از

جناب سید شریف الحسن صاحب، بی۔ اے (علیگ) ڈپ۔ ایڈ (عثمانیہ)

دماغی تربیت کے ساتھ ساتھ جسمانی تربیت بھی ضروری ہے بچوں کی تربیت میں کھیل جو اہمیت رکھتا ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے۔

قدیم ماہرین تعلیم کھیل کو صرف اس نقطہ نظر سے دیکھتے تھے کہ وہ دماغی آرام اور تفریح کا ایک نفیس ذریعہ ہے وہ سمجھتے تھے کہ کھیل کی ذہنی قیمت کچھ بھی نہیں ہے لیکن آج ہم کھیل کو ایک وسیع نظر سے دیکھتے ہیں۔

فروبل پہلا شخص تھا جس نے بتایا کہ کھیل ہی سے بچہ کی ابتدائی دماغی فعلیتوں کی تربیت ہوتی ہے اور وہ اپنے گرد و پیش کی مقررہ دنیا کی ضروری باتوں سے واقف ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ہر کھیل میں تخیل کے استعمال کی ضرورت ہوتی ہے اور ہر کھیل میں اس کھیل سے متعلق گذری ہوئی تفصیلات کو یاد رکھنے کے لئے حافظہ کی امداد درکار ہوتی ہے۔ گویا کھیل ذریعہ ہے ادراک کی تربیت اور حافظہ کی مشق کا۔ اور اس لئے تعلیم میں کھیل ذہنی اور جسمانی دونوں اعتبار سے مفید ہے۔

کھیل میں ایک اور تعلیمی فائدہ یہ بھی ہے کہ وہ بچہ کی معاشرتی خصلت کو ابھارتا اور اس کو ترقی دیتا ہے۔ جب لڑکا اکیلا کھیلتا ہے تو کھیل میں وہ جوش و مسرت باقی نہیں رہتا۔ جو اس کی حقیقی روح ہے۔

کھیل کی حقیقی روح مقابلہ اور دوسروں سے مزاحمت میں پوشیدہ ہے۔

عہد شباب سے کچھ قبل کا زمانہ محض معاشرتی خصائل ہی کی نشو و نما نہیں کرتا بلکہ مسلمہ احکام و قوانین کی تعمیل سکھاتا ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جبکہ ہم کو قانون اور معاشرتی درجہ پر زندگی بسر کرنے کی اہمیت سمجھانے کے بہترین مواقع حاصل ہوتے ہیں اور ہم لڑکوں کو بتا سکتے ہیں کہ یہ کس قدر ضروری ہے اگر ہم اپنے حقوق حاصل کرنا

اور دوسروں کے حقوق کو پامال نہ کرنا سیکھنا جانتے ہوں۔ کمرۂ جماعت میں ہم اخلاقیات۔ تاریخ۔ ادب اور ضبط کے اسباق میں ان امور پر صرف گفتگو کرتے ہیں لیکن آخر میں اشہد حصہ لا اسارہ جاتا ہے۔

برخلاف اس کے کھیل میں قانون کی پیروی کی ضرورت ایک مقررہ شکل میں پیش ہوتی ہے اور قانون کی خلاف ورزی ایسا نتیجہ پیدا کرتی ہے کہ جسے بچہ نہ صرف سمجھ جاتا اور محسوس کرتا۔ بلکہ یاد بھی رکھتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ کھیل دماغی سکون آرام اور تفریح کا ایک ذریعہ ہے وہ ایک قوت ہے جو تعلیمی اعتبار سے ذہن اور ارادہ دونوں پر اثر کرتی ہے اور ایک فعلیت ہے جو بچہ کی معاشرتی فطرت کو نشو و نما دیتی ہے کھیل کے متعلق کئی نظریے ہیں لیکن زیادہ تفصیل میں نہ جاتے ہوئے صرف یہ کہہ دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام نظریے ایک ہی مقصد کی طرف رہنمائی کرتے ہیں یعنی یہ کہ کھیل کی اہمیت مدرسہ کے نصاب اور جسمانی تعلیم میں از حد ضروری ہے بقول کسی کے، "کھیل طفولیت کا جز اور شباب کا حق ہے"۔

غرض اس دور حیات میں زندگی کی بقا کا انحصار قوت اور جبروت پر ہے۔ وہی قوم زندہ رہنے کے قابل سمجھی جاتی ہے جو قوی اور طاقتور ہو۔ اگر ہم کو بھی ایک اچھے اور کارآمد شہری بن کر ملک اور قوم کی تعمیر میں حصہ لینا ہے تو جسمانی تربیت کی طرف خاص طور پر توجہ کرنا اور زمانہ کا ساتھ دینا چاہئے ورنہ ہم سب کو مدرسوں اور مکتبوں ہی کی چار دیواری کے اندر دفن ہو جانا اور کبھی ترقی کا نام نہ لینا چاہئے۔

یاد آتے ہو

از جناب محمد عبدالقیوم صاحب انجم (حیدرآبادی)

طلوعِ صبح میں سو طرح کے فتنے جگاتے ہو — جگا کر مجھ کو خوابوں کی نئی دنیا بساتے ہو
تخیل میں نگاہوں سے گذر کر آتے جاتے ہو — ہنسانے کے عوض بےچین کرتے ہو رلاتے ہو
خدا جانے مجھے رہ رہ کے تم کیوں یاد آتے ہو

بہاروں کو لئے پھرتی ہے ہر رنگینیٔ قدرت — ہر اک برگ و شجر کی ہے چمن میں دیدنی ندرت
نظر آتی ہے گل بر دوش گویا حسن کی فطرت — مگر اس لطف کے عالم میں مجھ سے دور ہے راحت
خدا جانے مجھے رہ رہ کے تم کیوں یاد آتے ہو

کبھی بےچینیاں آ آ کے مجھ کو چھیڑ جاتی ہیں — کبھی مجبوریاں رہ رہ کے مجھ کو گدگداتی ہیں
کبھی ناکامیاں آپس میں مجھ پر مسکراتی ہیں — تمنائیں کبھی دیدار کی آنکھیں دکھاتی ہیں
خدا جانے مجھے رہ رہ کے تم کیوں یاد آتے ہو

بہ ہر صورت گذر جاتا ہے دن اور شام آتی ہے — مصائب کا نئے عنوان سے پیغام لاتی ہے
قیامت پر قیامت اور تازہ مجھ پہ ڈھاتی ہے — مرے جذبات کی دنیا میں اک ہلچل مچاتی ہے
خدا جانے مجھے رہ رہ کے تم کیوں یاد آتے ہو

کسی طائر کے نغمے پر سراپا گوش ہو جانا — کسی آہٹ کا پانا اور خودی بر دوش ہو جانا
کبھی دل کھول کر رونا کبھی خاموش ہو جانا — تصور ہی تصور میں کبھی بےہوش ہو جانا
خدا جانے مجھے رہ رہ کے تم کیوں یاد آتے ہو

سکوتِ شب ہے اور ساری خدائی محوِ راحت ہے — یہ عالم ہے کہ اب خوابیدہ گویا بزمِ عشرت ہے
مقدر اس کا ہے سر در جو اہلِ محبت ہے — یہاں کیا ہے؟ یہاں تو ایک میں ہوں اور وحشت ہے
خدا جانے مجھے رہ رہ کے تم کیوں یاد آتے ہو

گذر جانا مسلسل اس طرح فرقت کی راتوں کا — اور ان کو کاٹنا بیدار رہ کر غم کے ماتوں کا
سمجھتا ہے بہت دشوار معشوقوں کی گھاتوں کا — کہو۔ اب بھی اثر دل پر ہے کچھ انجم کی باتوں کا
خدا جانے مجھے رہ رہ کے تم کیوں یاد آتے ہو

بحیرۂ بالٹک کی ریاستیں آغوش اشتمالیت میں

از

جناب سید عابد علی صاحب بی۔ اے (عثمانیہ)

بحیرۂ بالٹک کی ریاستوں کا ماضی روس کی آغوش سیادت میں گزرا اور حال میں آزادی نصیب ہو کر ۲۵ سال بھی گزرنے نہ پائے تھے کہ یورپ کے سیاسی مدوجزر سے ان کا مستقبل پھر سے تاریک نظر آنے لگا ہے قلیل التعداد اور کمزور قوموں کا وجود طاقتور اور کثیر التعداد قوموں کی آنکھوں میں ہمیشہ خار کی طرح کھٹکتا رہا۔ کمزور ملکوں کا محل وقوع ان کے معاشی وسائل اور فوجی اہمیت استعماریت پسند ملکوں کو ہمیشہ سے دعوت مداخلت دیتے رہے ہیں۔ اور آج ان تمام خصوصیتوں کا اطلاق صد فیصد بحیرہ بالٹک کی ریاستوں پر ہو رہا ہے جو لحاظ اپنے محل وقوع، معاشی وسائل اور فوجی اہمیت کے یکے بعد دیگرے ایک نام و نہاد اور علمبردار حریت و مساوات اشتمالی ملک کی دیرینہ ہوس کا شکار ہوتی جا رہی ہیں۔

جرمنوں کا عمل دخل

قرون وسطی یعنے بارہویں صدی عیسوی میں یہاں پہلی دفعہ جرمن عنصر نے جگہ پائی۔ اور ایک عرصہ تک جرمنی کے فوجی سرداروں کے زیر سیادت رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان ریاستوں میں جرمن قوم کی اقلیتیں موجود ہیں۔ ہٹلر ان اقلیتوں کے نام سے یہاں مداخلت کے سامان مہیا کرنا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ اسٹونیا لٹاویا، اور لتھونیا۔ زرعی ملک ہونے کی وجہ سے بھی جرمنی کے لئے اہم ہیں۔ جنگ عظیم کے دوران میں جرمنوں نے ان پر حملہ بھی کیا تھا جس کی یاد غالباً یہاں کے باشندوں کے ذہن سے ابھی محو نہ ہوئی ہوگی۔ روس اور جرمنی کے معاہدہ عدم اقدام اور ساز باز سے قبل تک جرمنی ان ریاستوں کو اپنے قدیم حریف اور جدید حلیف

روس کے خلاف آلہ کار بنانے کی بہت کچھ کوشش کی جس وقت برطانیہ، فرانس، اور روس کے مابین جرمنی کے خلاف گفت و شنید جاری تھی۔ جرمنی نے ان کو روس سے توڑ کر اپنے ساتھ معاہدہ عدم اقدام کے رشتہ میں جوڑنا چاہا۔ اور یہ ریاستیں اگرچہ ان دونوں سے خوف زدہ ہیں۔ لیکن روس سے زیادہ۔ اس لئے روس کی حمایت میں آنے سے انہوں نے انکار کر دیا۔ اور جرمنی کو روس پر ترجیح دی۔

روس اور بحیرۂ بالٹک

روس کی سیاسی تاریخ میں اٹھارویں صدی عیسوی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ کیونکہ ۱۷۲۱ء میں پیٹر اعظم شہنشاہ روس نے بحیرہ بالٹک کی ریاستوں کو فتح کر کے اپنے سیاسی حلقۂ اثر کو بحیرۂ بالٹک کے ساحلوں تک پہونچا دیا جس کی بدولت روس نے یورپ تک رسائی حاصل کر لی۔ روسی انقلاب کے موقع پر ۱۹۱۹ء میں ان ریاستوں نے روس کے خلاف اعلان جنگ کیا اور آزادی حاصل کر لی۔ حصول آزادی کے بعد سے اس وقت تک ان ریاستوں نے روس کو ہمیشہ اپنا دشمن تصور کیا۔ اور آزادی کے بعد بحیرۂ بالٹک سے روسی سیادت کا خاتمہ ہو گیا اور روس کے لئے لینن گراڈ ہی صرف ایک ہی بندرگاہ رہگئی تھی۔ جو موسم سرما میں ناقابل عبور ہو جاتی ہے۔

لینن گراڈ اور بحیرۂ بالٹک کے درمیان ذرایع حمل و نقل کا خط فن لینڈ کی تنگ خلیج سے گذرتا ہے جس پر فن لینڈ اور اسٹونیا کا اقتدار ہے۔ اس کے علاوہ یہ بندرگاہ ۵ - ۶ مہینے تک موسم سرما میں ناقابل عبور و مرور ہو جاتی ہے۔

روس کا حالیہ اقدام

روس نے جرمنی روسی پیمان عدم اقدام سے قبل اپنے آیندہ ارادوں کو پردۂ اخفا میں رکھا۔ اور پولستان کی مکمل تسخیر تک خاموش رہا۔ اس کے بعد ہی یوکرین اور سفید روس کی اقلیتوں کے حقوق کی پامالی کی داستان حکومت پولستان کے خلاف شروع کر دی گئی۔ یہ اقدام گویا اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کی تمہید تھا۔ یورپ کے موجودہ خلفشار سے فائدہ اٹھا کر اسٹالن نے اسٹونیا کی جمہوریت کو مجبور کیا۔ کہ وہ روس کے لئے جزائر Ösel اور Dagö میں ہوائی اور بحری مراکز قایم کرنے کے حق کو تسلیم کر لے۔ جو بندرگاہ ریگا Riga پر تسلط قائم کرنیکی ایک کامیاب کوشش تھی۔ بندرگاہ ریگا اور ماسکو کے درمیان ریل موجود ہونیکی وجہ سے روس آیندہ بحیرۂ بالٹک کے علاقوں سے تجارتی تعلقات آسانی کے ساتھ قائم کر سکتا ہے۔

بحیرۂ بالٹک میں سب سے پہلے ریاست اسٹونیا کو اشتمالیت کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھنا پڑا۔ اس کی وجہ
یہ ہے کہ یہ ریاست دوسری ریاستوں کے مقابلہ میں کمزور اور فوجی نقطۂ نظر سے روس کے لئے زیادہ اہم بھی ہے
خلیج ریگا پر اثر قایم کرنے کے بعد فن لینڈ اور لٹویا روس کے رحم و کرم پر رہ گئے تھے۔ ان ہر دو ریاستوں
کے صدر مقامات (Riga) اور (Helsinki) جزائر اسٹونیا oesel اور Dagoe سے جن پر اب روس
قابض ہے۔ صرف (۱۶۰) میل کے فاصلے پر ہیں۔ ان سے کچھ ہی فاصلہ پر جزائر (Aland) ہیں جو ۱۹۲۱ء سے
فن لینڈ کے زیر سیادت ہیں۔ ان جزائر پر فن لینڈ کا اقتدار ہونے سے سویڈن کو اس بات کا اندیشہ ہے کہ
ان کو فوجی مرکز قرار دیکر سویڈن پر حملہ نہ کر دیا جائے۔ اس اندیشہ سے دونوں ملکوں میں کشیدگی پیدا ہوئی
تھی لیکن مجلس اقوام کے فیصلہ کے مطابق ان علاقوں کے فوجی استحکامات روک دیئے گئے۔ یورپ میں جرمنی اور
روس کے جارحانہ اقدام کو روکنے کے لئے دونوں ملکوں نے متحدہ طور پر ان کے عسکری استحکامات پر اپنی توجہ
مرکوز کر دی ہے۔

ریاستوں کا مستقبل

بحیرۂ بالٹک کی ریاستوں کے مستقبل کے متعلق پیش قیاسی کرنا واقعات حاضرہ کے مدنظر کوئی دشوار امر
نہیں۔ روس کا آہنی انسان۔ اسٹالن ہر طرح اشتمالی نظام حکومت ان کے سر تھوپنے کی تدابیر اختیار کرے گا۔
اس آمری نظام سے خوف زدہ ہو کر ان ریاستوں سے بارہا نہ صرف اپنی غیر جانب داری کا اعلان کیا بلکہ بصورت
مجبوری نازیت کو اشتمالیت پر ترجیح دی۔ روس اور جرمنی کے حالیہ دوستانہ تعلقات غیر مستحکم اور موقتی ہیں۔ جرمنی
کو روس کے پیمان عدم اقدام اور غیر جانب داری کی بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑی یعنے بحیرۂ بالٹک پر اپنا تسلط
جمانے کے منصوبہ سے ہمیشہ کے لئے دست بردار ہونا پڑا۔ اور روس کا موجودہ اتحاد محض اس لئے ہے کہ آئندہ
جرمنی کو اس کے دیرینہ ارادوں سے باز رکھا جائے۔ گویا یہ ملاپ آئندہ دائمی اور مستحکم علحدگی کا پیش خیمہ ہے۔
اگر جرمن اقلیتوں کی منتقلی عمل میں آجائے جس کے امکانات بعید از قیاس نہیں تو جرمنی معلوم نہیں پھر کس عذر کو
اپنے دعوے کی دلیل بنا کر مداخلت کے لئے اسباب فراہم کریگا۔ غرضکہ روس نے قبل از وقت اپنے آیندہ
تحفظ کا پورا پورا اہتمام کر لیا ہے۔ پولستان میں جرمنوں اور روسیوں کی ایک دوسرے سے قربت بہ نسبت
روس کے جرمنی کے لئے زیادہ خطرناک معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ اشتمالی نظام صنعتی آبادی کے لئے اپنے میں
زیادہ جاذبیت اور کشش رکھتا ہے۔ نازی حکومت کے موجودہ تشدد کے خلاف اہل جرمنی ممکن ہے اندرون
ملک ہٹلر اور اس کے رفقاء کے خلاف بغاوت کر دیں۔ جرمنی کے معاشی نظام کی پستی اور عدم استحکام کی وجہ سے

آیندہ انقلاب کے امکانات غیر یقینی ہیں۔ لہذا اس وقت تک نازیت اور اشتمالیت کے درمیان جو زبردست خلیج حائل تھی وہ آیندہ انقلاب کے بعد از خود پٹ جائیگی۔ اور پولستان ان دونوں جرانیم تحریکوں کا مقام اتصال یعنی سنگم بن جائیگا جس سے دنیا میں ایک ایسا عالمگیر انقلاب ہوگا جس کے نتائج بہت ہی خطرناک ہوں گے۔ (۵ ار اکٹوبر ۱۹۳۹ء)

غزل

از

جناب میر ممتاز علی صاحب ممتاز

چمن میں ان دنوں فصلِ خزاں ہے
ہیں گل خاموش، بلبل نوحہ خواں ہے

سفینہ، بحرِ الفت میں رواں ہے
الٰہی تو ہی اس کا پاسباں ہے

جہاں میں کیوں غرورِ عز و شاں ہے
کہ دو روزہ بہارِ بوستاں ہے

میرا مسکن، خرابات جہاں ہے
یہاں یارب سکونِ دل کہاں ہے

جگر میں ٹیس، لب پر آہ سوزاں
یہ میری مختصر سی داستاں ہے

کہاں جائیں دلِ مضطر کو لے کر
زمیں دشمن مخالف آسماں ہے

سنبھالوں کیسے دوشِ ناتواں پر
امانت کا تری بارِ گراں ہے

ضیائے رخ پہ تیری آو جفا جو
طلوعِ صبحِ محشر کا گماں ہے

یہ ہے ممتاز انجامِ محبت
قفس میں ہم، چمن میں آشیاں ہے

کہکشاں اور اس کے آگے

از

جناب سید نصیر الدین صاحب بی۔ اے (عثمانیہ)

لاپلاس کا خیال ہے کہ سورج اور تمام سیاروں کا مادہ پہلے ایک گرم اور حرکت کرنے والی گیسوں کی شکل میں تھا۔ رفتہ رفتہ یہ مادہ اسی کے جاذبہ کے تحت سکڑتا گیا جس کا ظاہری نتیجہ یہ ہوا کہ اس کا استوائی حصہ ایک حلقہ کی شکل میں علٰحدہ ہوگیا۔ اور یہ حلقہ بالکل اسی شکل کا تھا جیسا کہ آجکل زحل کا حلقہ ہے۔ اس طرح سکڑنے کا عمل مسلسل جاری رہا۔ اور مختلف حلقے وجود میں آئے۔ بالآخر درمیانی مادہ سورج بن گیا۔ اور حلقے کائنات میں پھیل گئے۔ چونکہ یہ حلقے ایک گردش کرنے والے مادہ سے بنے تھے۔ اس لئے یہ اپنے مرکز کے گرد گھومنا شروع کئے اور رفتہ رفتہ ایک واحد جرم فلکی میں تبدیل ہوگئے۔ سیارے بھی گردش کی وجہ سے سکڑتے گئے۔ اور ہر سیارہ ایک یا دو مزید حلقے چھوڑتا گیا۔ اور یہ حلقے توابع کی شکل اختیار کرلئے یہ وہ نظریہ ہے جس کو لاپلاس نے سیاروں کی ابتدائے آفرینش کے بارے میں پیش کیا تھا۔ بعض سائنسداں آج اب تک اس کو صحیح مانتے ہیں۔

اس طرح ہمیں معلوم ہوا کہ سورج گویا ایک مرکز ہے جس کے گرد کئی سماوی اجسام حرکت کرتے ہیں۔ چنانچہ زمین زہرہ، عطارد، مریخ مشتری، زحل، وغیرہ سورج کو مرکز بنائے ہوئے ناقصوں کی شکل میں حرکت کر رہے ہیں۔ اس نظام کو علم ہئیت میں نظام شمسی کہتے ہیں۔

نظام شمسی کا سب سے بڑا جرم سورج ہے۔ اس کا فاصلہ زمین سے ۹۳ کروڑ میل ہے۔ سورج کی کمیت زمین کی کمیت سے ۳۳۳ ہزار گنا زیادہ ہے۔ اس کی سطح کی تپش تقریباً ۶۰۰۰ درجہ ہے

اس کی سطح پر بے شمار دھبے ہیں جن کو داغ ہائے شمس کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ یہ اضافی طور پر کم روشن ہیں
داغ ہائے شمس عموماً دو حصوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو نسبتاً سیاہ ہوتے ہیں (Umbra) اور
دوسرے وہ جن کا بیرونی حصہ نسبتاً کم سیاہ ہوتا ہے (Pen umbra) کہلاتے ہیں۔ اگر سورج ٹھوس
یا مایع ہوتا تو اس کی سطح کامل طور پر سیاہ یا روشن نظر آتی۔ لیکن اس کے سیاہ دھبے اس بات کی دلیل
ہیں کہ سورج مختلف گیسوں پر مشتمل ہے۔

داغ ہائے شمس بعض اوقات اتنے بڑے ہوتے ہیں کہ ان کا قطر ۵۰۰۰۰ میل کے قریب ہو جاتا
اور (Pen. umbra) کی صورت میں ۲۰۰ ہزار میل ہو جاتا ہے۔ یہ داغ ہر روز یا ہر سال نہیں دکھائی دیتے
بلکہ ایک خاص زمانہ میں نظر آتے ہیں۔ مشاہدہ سے معلوم ہوا ہے کہ ہر گیارھویں سال سورج کے داغ زیادہ
زیادہ تعداد میں نظر آتے ہیں۔ سورج کے داغ کا راست اثر آب و ہوا اور موسم پر بھی پڑتا ہے یہ دھبے
وقتاً فوقتاً پھیلتے رہتے ہیں۔ مشاہدات سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ یہ سیدھے حرکت کرتے ہیں۔ جس سے
پتہ چلتا ہے کہ خود سورج مغرب سے مشرق کی طرف محور کے گرد حرکت کر رہا ہے۔ چنانچہ چھٹے دن یہ دھبے
بالکل غائب ہو جاتے ہیں۔

سورج کی سطح (۶ ہزار میل گہرائی تک) کرا سفیر (Chromosphere) کہلاتی ہے۔ اور
اس کے اوپر کی سطح کو (Prominences) کہتے ہیں۔ یہ دراصل چمکدار گیسوں کا بادل ہے۔ انکی بلندی
سورج کی سطح سے ۵۰ لاکھ میل تک ہوتی ہے۔ سورج کے بعد سب سے دلچسپ سماوی اجسام ستارے ہیں۔
جو رات کے تاریک پس منظر پر دھیمی روشنی سے ٹمٹماتے ہیں۔ دھیمی روشنی والے ستاروں کی تعداد جن کو ہم خالی
آنکھ سے دیکھ سکتے ہیں۔ ۶ ہزار کے قریب ہے لیکن دوربین سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ مقام جہاں
خالی آنکھ سے ایک ستارہ بھی نہیں دکھائی دیتا تھا وہاں بے شمار ستارے پائے جاتے ہیں۔ ایک ہیئت داں
کا خیال ہے کہ ستاروں کی مجموعی تعداد اتنی ہے کہ اگر ان کو دنیا کی آبادی پر تقسیم کر دیں تو ہر ایک کو سو ستارے
ملیں گے۔ ستاروں کو انکی چمک کے لحاظ سے مختلف اقسام میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اور علم ہیئت میں ان کو قدر کے
نام سے موسوم کرتے ہیں۔ ستاروں کی چمک دو چیزوں پر منحصر ہے۔ ایک تو ان کی جسامت اور دوسرے ان کا
بعد یا فاصلہ زمین سے۔ یعنی جس قدر کوئی ستارہ زمین سے دور ہوگا۔ اسی قدر اس کی چمک کم ہوگی بعض
ایسے ستارے بھی ہیں جنکی چمک سورج سے بھی زیادہ ہے۔ لیکن ہم ان کو محسوس نہیں کرتے جس کی وجہ زمین
سے ان کی دوری ہے۔ اس لئے ان کی چمک سورج کے مقابلہ میں بہت کم ہوتی ہے۔ چنانچہ [illegible]
(Acentalsnec) روشن ترین ستارے ہیں۔ ([illegible]) سب سے چمکدار ستارہ ہے اس کا فاصلہ

سورج کے فاصلے سے ۵۵۰ ہزار گنا زیادہ ہے۔ اس کی چمک سورج کی چمک سے ۲۷ گنا زیادہ ہے۔ اور عموماً سب سے زیادہ بڑے ستارے سُرخ اور سرد پائے گئے ہیں۔ یہ ستارے مدار زمین سے بھی بڑے ہوتے ہیں۔ چنانچہ (An Tares) اس کی بہتر مثال ہے۔ اس کا قطر ۴۰۰ کروڑ میل ہے۔ ستاروں کی ایک اور قسم ہے جو دیوہیکل ستارے (giant stars) کہلاتے ہیں۔ ان کا قطر سورج کے قطر کا دس گنا یا بیس گنا ہوتا ہے۔ یہ بہت گرم ہوتے ہیں۔ اِن کا رنگ نیلا ہوتا ہے۔

ستاروں کی ایک تیسری قسم بھی ہے جو بونے ستارے کہلاتے ہیں۔ ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ان کی سطح سرد اور ان کا رنگ سرخ ہوتا ہے۔ بونے ستاروں کی بھی ایک اور قسم ہے جو سفید بونے ستارے کہلاتے ہیں ان کا قطر زمین کی قطر کے برابر ہوتا ہے۔ اس کی تپش ۱۰ ہزار سنٹی گریڈ کے قریب ہوتی ہے۔ کرۂ سماوی میں اکثر ستارے تنہا سفر کرتے ہیں لیکن بعض ایسے ستارے بھی ہیں جو جوڑوں میں حرکت کرتے ہیں اِن کو ثنائی ستارے (Double stars) کہتے ہیں۔ اِن کے درمیان ایک خاص کشش ہوتی ہے جو اُن کو فضا میں حرکت کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ اِس نظام میں ہر ستارہ دوسرے کے گرد گردش کرتا ہے۔

کسی تاریک رات میں اگر ہم ستاروں کی دنیا کی طرف دیکھیں تو ہمیں بہت دور ایک ٹھوس نما ستاروں کی دیوار دکھائی دیگی۔ اس ٹھوس نما دیوار کو کہکشاں (Mekyway) کہتے ہیں۔ اس مقام پر ستارے اس قدر کثرت سے دکھائی دیتے ہیں کہ دوربین سے اگرچہ کہ سب کے سب نظر نہیں آتے۔ لیکن کروڑوں ستاروں کی چمک اس بادل نما روشنی کا نتیجہ ہے۔

کہکشاں کے آگے بہت زیادہ فاصلہ پر ایک اور دلچسپ منظر نظر آتا ہے۔ یہ دلچسپ منظر اگرچہ کہ خالی آنکھ سے نظر نہیں آتا۔ لیکن دوربین سے چمکدار روشنی کا ایک ٹکڑا دکھائی دیتا ہے۔ جس کو سحابی (Nebulae) کہتے ہیں۔ یہ سحابی ستاروں کے مجموعہ کی ایک فضا ہے اگرچہ کہ یہ بہت چھوٹے ہوتے ہیں لیکن زمین سے کافی فاصلہ پر ہیں۔ ان کے فاصلے کا اندازہ اس مثال سے ہو سکتا ہے کہ ایک ۵۰۰۰ ہزار میل فی گھنٹہ چلنے والے راکٹ (Rocket) کو سُرخ دیوہیکل ستاروں کے طے کرنے کے لئے اگر ۹ سال صرف ہوں تو سحابی کے لئے ۹۰ ہزار سال درکار ہونگے۔ اگر زمین کو اکائی مان لیا جائے تو اُن کی جسامت کا اندازہ ذیل کے اعداد سے ہوگا۔

زمین	= ۱	= ۱	
مشتری	= ۱۰۰۰	$(10)^3$	
سورج	۱۰۰۰،۰۰۰	$(10)^6$	
سورج (نیلے تارے) (Blue star)	= ۱،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰	$(10)^9$	
سرخ تارے (Red star)	۱،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰	$(10)^{12}$	
سحابی (Nebulae)	۱،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰ =	$(10)^{15}$	

آصفیہ میگزین

(بچوں کا حصہ)

مدیر

ریاض الدین

شریک مدیر

عبدالمغنی ۔ مغنی

جلد اوّل | جنوری سنہ ۱۹۴۰ء | شمارہ اوّل

مدرسہ آصفیہ

از

جناب مغنی صاحب صدیقی متعلم مدرسہ آصفیہ

سمت مشرق شہر میں راحت فضا ہے اک مقام
لے رہا ہے گرد میں سبزہ ہی سبزہ جابجا
زندگی کی داستاں کا ایک رنگیں باب ہے
کس قدر دلکش ہیں اسکی یہ چمن آرائیاں
آسماں سے باتیں کرتی ہے عمارت خوشنما
درسگاہِ آصفیہ اس کا اصلی نام ہے
اس جگہ آتا نہیں تفریق مذہب کا سوال

علم کی بارش جہاں پر ہوتی رہتی ہے مدام
کسقدر دلکش نظر آتی ہے یارب یہ فضا
بحرِ علم و فضل کا یہ گوہر نایاب ہے
جس طرح گل کی دولہن ہیں جلوہ گر رنگینیاں
ہونہاران دکن کے حق میں ہے شمع ہدیٰ
حیدرآباد دکن پر اس کی بخشش عام ہے
اس جگہ معصوم بن جاتا ہے انساں کا خیال

مدرسہ مخزن ہے مغنی علم کا آداب کا
یہ وہ کشتی ہے کہ جسکو ڈر نہیں گرداب کا

دانتے ان لوگوں کی جگہ دوزخ کا آخری کونہ قرار دیتا ہے جو یہ جانتے ہوئے بھی کہ دنیا رنج وغم کا مقام ہے۔ خواہ مخواہ اپنی مصیبتوں پر رو رو کر جان ہلکان کرتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُن کو رنج وغم سے اُنس ہے اور وہ چمگادڑ کی طرح روشنی کو چھوڑ سائے ہی کو گھورنے کے عادی ہیں۔ اگر دنیا میں روشنی ہی روشنی ہوتی تو آنکھیں چندھیا جاتیں اور محض تاریکی ہی سے زندگی اجیرن ہو جاتی۔ اس لئے دنیا کے مصور نے اِن دونوں کی آمیزش سے ایک ایسی تصویر بنائی ہے جس کو انسان کہتے ہیں۔ انسان کو چاہئے کہ وہ سایہ سے نہ بھاگے اور روشنی کا پیچھا کرتے رہے۔ بغیر دکھ کے سکھ حاصل نہیں ہوتا۔ اُن آنکھوں کا کیا کہنا جو صرف تصویر کا ایک ہی رخ دیکھتی ہیں۔ روشنی میں بھی اُن کی آنکھیں سائے ہی کو تلاش کرتی ہیں۔

زندگی کے دشمن، رنج وغم، فکر اور بدقسمتی ہی نہیں ہیں بلکہ اصل دشمن تو روح کے اُس دھندلکہ میں ہے جہاں نہ روشنی کا گذر ہے اور نہ سایہ کا۔

(ماخوذ از ڈاکٹر ناسن)

قدیم ہندوستانی صنعتیں

از

جناب محمد رياض الدين صاحب متعلم مدرسہ آصفیہ، و مدیر

(بچوں کا حصہ)

کسی متمدن ملک کی شہرت وعظمت کا اندازہ آجکل اُس کی صنعت وحرفت اور تجارت سے کیا جاتا ہے
زمانہ قدیم میں ہندوستان کا شمار بھی دنیا کے متمدن ممالک میں ہوتا تھا۔
بہ لحاظ دولت، زراعت، صنعت وحرفت اور عظمت کے یہ چودھویں اور پندرھویں صدی میں دنیا کے
ہر ملک سے پیش پیش تھا چنانچہ لوگوں نے اس کی تلاش میں نئی دنیا معلوم کر لئے۔ اُس زمانہ میں وہ اپنے
قدرتی خزانوں سے مالا مال تھا۔ اور اُس کے استعمال کے طریقے بھی جانتا تھا۔
وہ نہ صرف ایک زراعتی ملک ہی تھا بلکہ اُس کی صنعت وحرفت اور تجارت کی شاہرامیں ایران مصر
آفریقہ اور یورپ وغیرہ تھے۔
بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ہندوستان صرف ایک زراعتی ملک ہے جو ایک غلط فہمی پر مبنی ہے۔
چنانچہ مسٹر ہنری سینٹ جارج ٹکر ڈائرکٹر ایسٹ انڈیا کمپنی) نے ۱۸۲۳ء میں ہندوستانی مصنوعات کے
بارے میں ایک جگہ بیان کیا ہے کہ ہندوستان پہلے ایک صنعتی ملک تھا مگر اب ایک زراعتی ملک بن گیا ہے۔
اب ہم ہندوستان کی قدیم صنعتوں کا ذکر مختصر طور پر کرینگے زمانہ قدیم میں ہندوستان کو کپڑے کی صنعت کے لئے
جو بین الاقوامی شہرت حاصل تھی۔ اُس سے دنیا واقف ہے۔ چنانچہ اٹھارویں صدی عیسوی تک بھی ہندستان
تمام دنیا کو ہر قسم کا کپڑا کم وبیش مہیا کرتا رہا۔
اُس زمانہ میں یورپ کی شہزادیاں اور امیر زادیاں ہندوستانی کپڑا بڑے فخر سے استعمال کیا کرتی تھیں۔
صنعت پارچہ بافی میں ہر قسم کے کپڑے شامل تھے۔ ڈھاکہ کے ململ کے متعلق محمد احمد صاحب سبزواری
اپنے مضمون "ہندوستان کی قدیم صنعتیں" میں فرماتے ہیں کہ یہ کپڑا اس قدر باریک اور مہین ہوتا تھا کہ

تیس گز کپڑا انگوٹھی میں سے آسانی سے گذر سکتا تھا اور اس کی قیمت ۴۰ پونڈ فی گز ہوا کرتی تھی۔

اونی کپڑے بھی یہاں بہترین بنے جاتے تھے جس میں ہر قسم کی شال، قالین اور چادریں وغیرہ شامل ہیں قالین کی صنعت کے لئے ورنگل مشہور تھا۔ چنانچہ یورپ کی حال ہی کی نمائش میں اس نے تمغہ بھی حاصل کیا ہے۔

ریشم اور زر کا کام بھی قدیم زمانے سے ہی کیا جاتا ہے جس میں مشروع، کمخواب، مشجر وغیرہ مشہور ہیں جس کی مانگ جاپان، مصر، روم، اور انگلستان تک ہوا کرتی تھی۔ سبزواری صاحب لکھتے ہیں کہ آفریقہ میں ریشمی کپڑے کے معاوضہ میں چوگنا سونا یہاں کے تاجروں کو ملتا تھا۔ لوہے کی صنعت بھی یہاں کی قدیم صنعت ہے چنانچہ آریاؤں کے ہندوستان آنے سے پیشتر بھی یہاں کی قدیم نسلیں لوہے کا استعمال بخوبی جانتی تھیں۔ ہندوستانی فولاد سے آلات زراعت اور آلات حرب بھی یہاں کے باشندے بخوبی بنالیتے تھے۔

میناکاری میں بھی ہندوستان آپ اپنی نظیر تھا جس کی یادگار بیدر کی صنعت میناکاری پیش کرتی ہے۔

جہاز سازی اور جہاز رانی میں بھی ہندوستانی بڑے ماہر ہوا کرتے تھے اور اسی کے ذریعہ اُن کی صنعتوں کی تجارت ہوا کرتی تھی اور تجارتی جہازوں کا وزن ۶۰ ہزار ٹن تک ہوا کرتا تھا۔ جس کی توثیق مورلینڈ کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے کہ مغلوں کے زمانہ میں دریائی سفر کا عام رواج تھا اور اکبر کی پوری فوج اپنی کشتیوں کے ذریعہ بہ یک وقت جمنا کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پہنچ سکتی تھی۔

اٹھارویں صدی عیسوی میں بھی یہاں ایسے جہاز موجود تھے جو کہ تجارتی سامان ہندوستان سے انگلستان پہنچاتے تھے۔ شیشے کی صنعت اس قدر قدیم ہے کہ رگ وید میں بھی اس کا ذکر موجود ہے۔

ہندوستانی پندرہویں اور سولہویں صدی عیسوی میں شیشے کے گلاس، چوڑیاں، وغیرہ تیار کرسکتے تھے۔

شکر سازی کی صنعت بھی ہندوستان ہی سے نکلی ہے جس کے خریدار امریکہ، روم، چین اور مصر تھے اس صنعت کو حریفوں نے نقصان پہونچایا۔ اس طرح ہندوستان میں شکر سازی کا خاتمہ اٹھارویں صدی عیسوی میں ہوا۔

بعد میں ہندوستان کی تجارت اور صنعت وحرفت کو جو نقصان پہنچا اُس کی وجہ مسٹر مارٹ گومری مارٹن یہ بتلاتے ہیں۔ "ہندوستانی مال کی درآمد روکنے کے لئے محصول کی شرح میں معتدبہ اضافہ کردیا گیا جس کی وجہ سے دیسی صنعتیں سرعت رفتار کے ساتھ روبہ زوال ہوگئیں۔ اس لئے ہندوستان بجائے صنعتی ملک کے زراعتی ملک بنگیا۔ اور اب ہندوستان کے ۷۵ فیصدی باشندے زراعت پیشہ ہیں۔ چونکہ ہندوستان کی مفلوک الحالی دن بدن بڑھتی جارہی ہے اس لئے ہم کو چاہئے کہ جلد از جلد صنعت وحرفت کی طرف پھر سے متوجہ ہوجائیں۔ فقط

او حسن کے متوالے ــــ شباب میں سرشار ــــ مستی میں مخمور ــــ آ ــــ میرے من مندر کی دیوی ــــ آ ــــ سن ــــ تیرا پریم پجاری ــــ پریم کا گیت گا رہا ہے ــــ آ ــــ دیکھ ــــ تیری سیاہ ناگن جیسی زلفیں گلاب جیسے رخساروں پر بکھر رہی ہیں ــــ دنیا کی نعمتیں اُن کے آگے ہیچ ہیں ــــ تیرے ماتھے کی بندیا سے ــــ سورج کی روشنی ماند ہے ــــ تیری عرق آلود جبین پر ــــ موتی نثار ہیں ــــ تیرے لب لعلین ــــ گلاب کی پنکھڑیوں کو مات کر رہے ہیں ــــ تیرے مسکرانے پر ــــ بجلی کی تڑپ کا دھوکا ہوتا ہے ــــ تیرے چمکتے دندان سے ــــ چاند کی روشنی مدہوش ہے ــــ تیری ابروؤں پر ــــ قوس قزح شرماتی ہوئی ــــ نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے ــــ تیری مدبھری نینوں پر نرگس قربان ہو رہی ہے ــــ تیرے رگ گل سے نازک مژگان پر ــــ دنیا کی نزاکتیں نثار ہیں ــــ تیرے عارض کی لطافت پر ــــ گلاب پژمردہ ہے ــــ تیرے خوشی کے آنسوؤں پر ــــ لولوئے آبدار شرمسا ہے ــــ تیرے قد پر ــــ سرو جھک جھک کر قدمبوس ہو رہا ہے ــــ تیری آواز کے آگے ــــ دنیا کے راگ بے مزہ ــــ پپیہے کا پی کہاں اور کوئل کی کوک پھیکی ــــ تیرے خرام ناز سے ــــ کبک دری منفعل و شرمسار ــــ تیرے دست رنگین کے آگے ــــ شفق کی رنگت مدہم ــــ تیرے شباب نوخیز سے ــــ موسم بہار حیران سر بہ گریبان ــــ تیرا پریم پجاری تیرے درشن کو کھڑا ہے ــــ آ ــــ دیکھ ــــ تیرا پجاری کتنا بیقرار ہے ــــ او سنگدل ــــ نہیں ــــ نہیں ــــ سنگدل نہیں رحمدل ــــ یہ ٹھیک ہے ــــ تیرے چرنوں تلے آنکھیں بچھانے والا ــــ دل سے قدر کرنیوالا ــــ تیرا پجاری ــــ ہاں بھول نہ جا ــــ بھول نہ جا ــــ اپنے چاہنے والے کو ــــ آ ــــ درشن دے ــــ آ ــــ درشن دے ــــ آؤ ــــ درشن دینے والے ــــ

سید محمد اکبر خان رضوی متعلم دہم مدرسہ آصفیہ

۱۔ گناہ ایک کوفت ہے جس کے سرزد ہونے سے انسان کو کبھی مسرت نہیں ہوتی۔

۲۔ گناہگار دنیا میں کبھی خوش نہیں رہ سکتا۔

۳۔ نیکی ابدی راحتوں کا سرچشمہ ہے جس کا ایک قطرہ انسان کی دنیا بدل دیتا ہے۔

۴۔ پاپ کی ناؤ بھر کر ڈوبتی ہے لیکن نیکی ایک لافانی شئے ہے۔

۵۔ خواہش ہی وہ چیز ہے جو انسان کی زندگی کو مبتلائے غم کر دیتی ہے۔

۶۔ محبت اور جنگ ہی وہ دو چیزیں ہیں جس میں انسان ناجائز چیزوں کو بھی جائز قرار دیتا ہے۔

۷۔ حسد بری بلا ہے جو انسان کو غم کے بھیانک غار میں جھونک دیتی ہے۔

۸۔ رحم کے آغوش میں ابدی سکون ہے۔

۹۔ ہر چیز جو انتہائی معیار پر پہونچ جائے۔ خطرناک ہوتی ہے۔

۱۰۔ دنیا فریب کا مسکن ہے جس میں نیک راہ پر چلنا ایک انتہائی مشکل امر ہے۔

۱۱۔ اگر پشیمان نہ ہونا چاہتے ہو تو ہوس کے غلام نہ بنو۔

۱۲۔ بڑے آدمی مقاصد رکھتے ہیں اور عوام خواہشات۔

مصطفےٰ حسین

(متعلم سکنڈ فارم دٹی کالج)

صبح کا سہانا وقت تھا۔ بلبل ابھی چہچہانا شروع نہیں کیا تھا۔ ہاں چمن میں پھول بادِ صبا کی آغوش میں مست تھے۔ اس وقت صرف کسانوں اور بیلوں کے گھنٹیوں کی آواز سنائی دیتی تھی جو کھیتوں کو جا رہے تھے۔ رفتہ رفتہ شاہ خاور کی دلخوش کن اور شفاف شعاعوں نے آسمان پر اپنا جال بچھا دیا تھا۔ اس وقت ندی کا کچھ عجیب لطف پرور منظر تھا۔ وہ اپنی معمولی رفتار سے چھل بل و شور کرتی ہوئی بہہ رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ بھی اپنی داستان غم ڈوبتے ہوئے تاروں کو سنا رہی ہے۔

میں ابھی تک اپنے بستر پر لیٹا ہوا انگڑائیاں لے ہی رہا تھا کہ دفعتاً ایک ہوا کے جھونکے نے میرے کمرے کے دریچوں کو جو باغ کی جانب کھلتے تھے چکنا چور کر ڈالا۔ اور شیشوں کے ٹکڑے فرش پر بکھر گئے۔ ناگاہ میری نگاہ ایک ریچھ کے جوڑے پر پڑی جو پانی پینے آیا تھا۔ فرط مسرت سے میری باچھیں کھل گئیں۔ کیونکہ میں ان کا ایک مدت سے متلاشی تھا اور یہ مجھے خواب میں بھی نظر نہ آتے تھے۔

میں نے آہستہ سے بندوق اٹھالی اور دبے پاؤں چٹانوں کے پیچھے سے ندی کے کنارے پہنچ گیا اور کیا دیکھتا ہوں کہ دونوں پانی پینے میں مشغول ہیں۔ میں نے نہایت اطمینان سے نشست لی اور بندوق داغ دی۔ گولی نر کے سینے میں لگی۔ اور وہ تڑپ تڑپ کر سرد ہو گیا۔ مادہ بیتاب ہو گئی اور سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ اس اثنا میں اس نے مجھے بھی دیکھ لیا میں اس کا دشمن تھا۔ اس کو مجھ پر حملہ کر دینا چاہئے تھا یا حملہ نہ کرتی تو کم از کم بھاگ جاتی لیکن وہ اپنے رفیق حیات کے سرہانے غمگین بیٹھی رہی اس لئے کہ اب اس کو اپنی جان کی پرواہ نہ تھی۔ اس کو غالباً رہ رہ کر وہ زمانہ یاد آتا ہوگا جبکہ وہ دونوں اس جنگل میں آزاد گھوما کرتے تھے لیکن اب وہ اس دنیا کے سفر میں بالکل اکیلی ہے نہ کوئی مونس ہے نہ غمخوار، یہ حال دیکھ کر مجھ پر بھی رقت طاری ہو گئی۔ میں چشم نم واپس ہوا۔ میرے دل پر اس واقعہ کا بہت گہرا اثر ہوا۔ میں نے بندوق توڑ ڈالی سامان شکار کو آگ لگا دی گویا یہ میرا آخری شکار تھا۔

از

جناب پادشاہ حسین صاحب برق متعلم جماعت دہم مدرسہ فوقانیہ عثمانیہ آصفیہ

(۱)

ساون کی گھٹا جب چھاتی ہے
مینہ باغوں میں برساتی ہے
میخواروں کی بن آتی ہے
حسرت بھی کہیں ہٹ جاتی ہے
"تم یاد مجھے کیوں آتے ہو"

(۲)

اسکول میں جب میں آتا ہوں
احباب سے ہاتھ ملاتا ہوں
ہر ایک کو خوش پاتا ہوں
جب پچھلا سبق دہراتا ہوں
"تم یاد مجھے کیوں آتے ہو"

(۳)

جب پنگھٹ سے سب آتی ہیں
گاگر کو بھر کر لاتی ہیں
کچھ چھیڑتی شرماتی ہیں
سب مل کر ساون گاتی ہیں
"تم یاد مجھے کیوں آتے ہو"

(۴)

جب باغ میں بلبل گاتے ہیں
گل کھلکر ہنستے جاتے ہیں
ہم دل پر چوٹیں کھاتے ہیں
گذرے ہوئے دن یاد آتے ہیں
"تم یاد مجھے کیوں آتے ہو"

(۵)

کیا ہجر کی راتیں ہوتی ہیں
جو دل میں خار چبھوتی ہیں
ہوش آئے ہوئے سب کھوتی ہیں
تقدیریں میری سوتی ہیں
"تم یاد مجھے کیوں آتے ہو"

(۶)

میخانے میں ساقی آتا ہے
کوئی خالی جام دکھاتا ہے
کوئی ساغر منہ سے لگاتا ہے
الفت سے دل بھر جاتا ہے
"تم یاد مجھے کیوں آتے ہو"

دنیائے سائنس کے درخشاں ستارے

۱۔ گیلی لیو ـــــــــ دوربین کا موجد

۲۔ نیوٹن ـــــــــ جاذبہ زمین کا دریافت کرنے والا

۳۔ جیمس واٹ ـــــــــ دخانی انجن کا موجد

۴۔ جارج اسٹیفن سن ـــــــــ ریلوے انجن

۵۔ سر ہمفری ڈیوی ـــــــــ چراغ محفوظ

۶۔ سیمول مورس ـــــــــ ٹیلگراف

۷۔ الکزنڈر گراہم بل ـــــــــ ٹیلیفون

۸۔ تھامس اڈیسن ـــــــــ گراموفون

۹۔ مارکونی ـــــــــ لاسلکی

۱۰۔ جیمس سمپسن ـــــــــ کلوروفارم

محمد اشفاق الدین
متعلم سٹی کالج
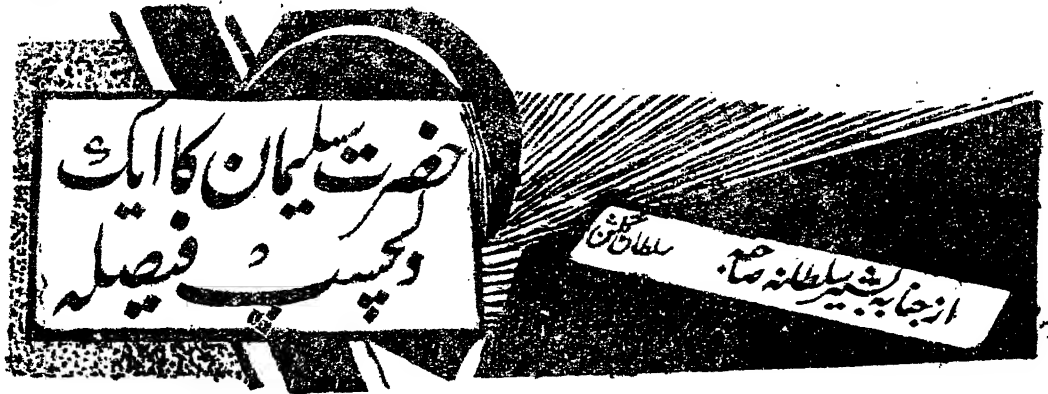
ایک مرتبہ حضرت سلیمانؑ کے دربار میں مچھر جمع ہوکر حاضر ہوئے اور عرض کی کہ حضور کی انصاف گستری و داد پروری عالم میں اظہر من الشمس ہے اگر ہم شومیٔ قسمت سے انصاف نہ بھی پائیں تو عجیب بات ہوگی حکم ہوا کہ ماجرا بیان کیا جائے۔ مچھر ایک زبان ہوکر عرض کئے کہ ہوا جس پر ہر جاندار کا دارو مدار ہے اور جو آپ کے تخت معلیٰ کی حامل ہے ہماری جان کا وبال ہے۔ جہاں ہم مقیم ہوتے ہیں وہاں یہ پہونچکر ہمیں نکالدیتی ہے سلیمان علیہ اسلام حیران تھے کہ ہوا سے کس طرح انتقام لیا جائے۔ اور ان فریادیوں کو کیا جواب دیں کہ اتنے میں آپ کے وزیر باتدبیر آصف بن برخیا نے عرض کی کہ حضرت جب تک فریقین نہ حاضر ہوں فیصلہ کس طرح کیا جاسکتا ہے شاید کہ ہوا کا بھی کوئی عذر ہو

حکم ہوا کہ

ہوا کو فوراً حاضر کیا جائے۔ جب ہوا آئی تو مچھروں کو غائب ہونے دیر نہ لگی۔ مقدمہ ایک طرفہ ہوا کے حق میں فیصل ہوا۔ فقط

ہمارا اسکوٹ کیمپ

جیسا کہ تمام مدارس میں اسکوٹ ہوا کرتے ہیں اور وہ اکثر زمانہ تعطیلات میں کیمپ کو جایا کرتے ہیں ہمیں بھی بہت دنوں سے انتظار تھا کہ کب تعطیلات ہونگی اور ہم کب کیمپ کو جائیں گے۔ چنانچہ ۱۲ ستمبر کو پانچ روز کے تعطیلات ملیں اور ان چھٹیوں کو ہمارے اسکوٹ کے لڑکوں نے غنیمت سمجھا اور کیمپ کا ارادہ کر لیا۔ اسکوٹ ماسٹر صاحب سے کیمپ کے سفر کے لئے اجازت مانگی تو ماسٹر صاحب نے بخوشی اجازت دیدی اب ہم خوشی کے مارے پھولے نہیں سماتے تھے۔ جب ہم گھر پہونچے تو اپنے اپنے لئے سفری بستروں کی اور توشوں کی تیاریاں شروع کیں۔

دوسرے دن صبح کے پانچ بجے اٹھے اور جلدی جلدی کاچی گوڑہ اسٹیشن پہنچے۔ یہ اسٹیشن حیدرآباد کا بڑا اسٹیشن مانا جاتا ہے یہاں پہنچتے ہی ہم تمام پلیٹ فارم میں ادھر ادھر خوب پھرتے رہے ریل آنے کے لئے کچھ دیر تھی۔ پلیٹ فارم پر پاسنجروں کی چہل پہل کافی تھی۔ ہمارے اسکوٹ کے لڑکے سامان کی طرف متوجہ ہوئے اور ماسٹر صاحب نے ٹکٹوں اور ڈبہ کا انتظام کر کے آہستہ آہستہ چپ چاپ ہماری طرف چلے آ رہے تھے کہ اتنے میں ریل کی آہٹ معلوم ہونے لگی۔ اور ریل دھیمی دھیمی رفتار سے پلیٹ فارم پر آئی اور کھڑی ہوگئی ماسٹر صاحب نے ہمارے لئے ڈبہ کا انتظام پہلے ہی سے کرائے تھے۔ اس لئے ایک ڈبہ خاص ہمارے لئے پاسنجروں کے ڈبوں کے پیچھے لگایا گیا۔ ڈبہ میں ہمارا سامان رکھ لیا گیا۔ اور ہم بھی سوار ہوگئے۔ گارڈ نے سیٹی بجائی اسی سیٹی کے ساتھ ہی ریل کی سیٹی ہوئی اور پٹری پر ایک جھٹکا سا محسوس ہوا۔ ریل گاڑی سیٹی دیتے ہوئے نکل گئی جب پلیٹ فارم سے باہر ہوئی تو ہم تمام کھڑکیوں میں سے جھانک رہے تھے۔ ریل کا راستہ آبادی کے قریب سے گذر رہا تھا صبح کے ۶ بجے کا وقت تھا۔ آبادی میں خفیف سی چہل پہل تھی۔ گلی کوچوں میں مسلمان مسجدوں سے نکل رہے تھے۔ اور ہندو عورتیں اپنے اپنے دروازوں کے سامنے پانی چھڑک رہی تھیں۔ کوئی جھاڑو جھٹک دے رہی تھیں۔ ریل کی رفتار بڑھتی جاتی تھی جوں جوں رفتار میں تیزی ہوتی تھی۔ آبادی دور اور جنگل قریب ہوتا جاتا تھا جنگل کا سماں تو بہت دلچسپ اور نظر فروز تھا۔ آبادی سے قریب کھیت اور باولیاں نظر آنے لگیں۔ کسان کھیتوں میں پانی دے رہے تھے۔ جب یہ دلفریب منظر نظر سے غائب ہوگئے تو چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں اور جھاڑیوں اور سبزہ سے ہماری آنکھوں میں ایک قسم کی تراوٹ پیدا ہو رہی تھی۔ دو چار اسٹیشنوں تک یہی نظارہ رہا اس ایک دم آنکھوں سے

وہ مناظر غائب ہوئے۔ اور اسٹیشن منوہر آباد آپہنچا۔ ماسٹر صاحب نے ہم کو اترنے کا حکم دیا یہ بہت چھوٹا اسٹیشن ہے یہاں کیا تجربہ تو کیا قلی اور ریل کے نوکروں کا تک پتہ نہ تھا۔ یہاں گاڑی دو منٹ ٹھیرتی ہے جلدی اتر کر ہم نے اسباب ڈبہ سے پلیٹ فارم پر اتار لیا۔ اور ماسٹر صاحب نے بس کا فوراً انتظام کر دیا۔ اسٹیشن کے قریب ہی ایک چھوٹا سا میدان تھا۔ میدان کے درمیانی حصہ میں ایک چھوٹا ٹیلہ بھی تھا۔ اس کے آس پاس کھیت اور باولیاں بھی تھیں ماسٹر صاحب نے اسی میدان کو کیمپ کے لئے منتخب کیا۔ اور ہم سب بس سے اتر گئے۔ اس وقت آٹھ بجے کا عمل ہوگا۔ ہم سب باولیوں کی طرف گئے ہم میں سے کچھ تو ماسٹر صاحب کی اجازت سے تیرنے لگے۔ اور کچھ منہ ہاتھ دھوکر اوس ٹیلے پر آئے۔ گھروں کے توشے سبھوں نے ملکر کھائے ناشتہ کے بعد ماسٹر صاحب نے اسکوٹ کا تعلیمی پروگرام شروع کیا۔

پہلا دن بعد ناشتہ کے ماسٹر صاحب پروگرام تیار کرنے میں مصروف تھے اور ہم نے تھوڑی دیر آرام لیا جب ماسٹر صاحب نے اوقات نامہ مکمل کر لیا تو ہمارا پہلا کام یہ تھا کہ چار خیمے آج شام تک استادہ کریں۔ درمیان میں ہم کو کھانا پکانے اور کھانے پینے کے لئے بارہ بجے سے دو بجے تک کی تفریح ملا۔ دو بجے کے بعد خیموں کے کام میں ہم مشغول ہوگئے دو بجے سے چار بجے تک خیموں کے استادہ کرنے میں مصروف رہے ساڑھے چار بجے چاہ تیار کی اور بعد فراغت ساڑھے چار سے سات بجے تک ہم نے مختلف اقسام کے کھیل کھیلے اور پروگرام کے لحاظ سے سات بجے سے آٹھ بجے تک کھانا پکانے اور کھانے کا وقت تھا۔ ایک خیمے میں ایک بڑا دسترخوان بچھا کر ہم سب نے کھانا کھایا۔ اور رات کے نو بجے سے صبح کے ۵ بجے تک خوب سوتے رہے۔

دوسرا دن صبح چھ بجے ماسٹر صاحب نے اسکوٹ کی سیٹی دی۔ اور ہم تمام لڑکے نماز فجر سے فارغ ہوکر فوراً ہی قطاریں باندھ لیں۔ اور ماسٹر صاحب کے مشورہ پر ورزش شروع کی ایک گھنٹہ ورزش کرنے کے بعد ماسٹر صاحب نے ناشتہ کا پکوان پکانا شروع کروایا۔ ہم سبھوں نے ملکر ماسٹر صاحب کے مشورے کے برابر پکایا اور دسترخوان بچھا کر ناشتہ کر لیا۔ نو بجے تک پکانے اور کھانے سے فارغ ہوکر ۹ سے ۱۰ بجے تک صنعتی کام سکھایا گیا۔ اور دس سے بارہ بجے تک صفائی اور مرہم پٹی کا کام سیکھتے رہے۔ پھر بارہ بجے سے دو بجے تک ماسٹر صاحب دوپہر کا پکوان بتاتے تھے اور ہم سلیقے سے پکانے اور کھانے میں مصروف ہوئے ۲ بجے سے چار بجے تک ماسٹر صاحب نے اخلاقی باتیں بتائیں۔ چار سے ساڑھے چار تک چاء کے بنانے اور چاء نوشی کا وقت تھا۔ ساڑھے چار سے سات بجے تک خوب گیمیں وغیرہ کھیلا کرتے تھے سات بجے سے ۹ بجے تک ڈنر کا پکوان شروع کرتے تھے کام اتنا جلد ہو جاتا تھا کہ گھنٹوں کا کام چند منٹوں میں ختم ہوتا تھا اس کا سبب یہ تھا کہ سب ملکر ایک کام کو ختم کرنے کے بعد دوسرا کام شروع کرتے تھے اور ہر کام کو آپس میں تقسیم کر لیا کرتے تھے۔ اس لئے ہم کو تمام کاموں میں بہت آسانی ہوتی تھی۔ ایسے ہی پروگرام سے باقی تین دن گذارے اور تین دن کے بعد اپنے اپنے گھروں کو پہنچے مگر یہ پانچ روز ہمارے کیمپ کے ایسے معلوم ہوتے تھے۔ جیسے کہ ہر دن عید ہے اور ہر رات شب برات۔ فقط

خطیب مقصود حسین۔ انجمن ال سعد آباد

مطبوعہ عہد جوبلی پریس بازار علیلی بیلا حیدرآباد دکن

ہر لحظہ نیا جوش نیا ذوق تجلی

اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

— اقبال

نبیل مطبوعہ مہدی آرٹ پریس